"اور ناصرہ نام ایک شہر میں جا بسا تاکہ جو نبیوں کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔" بعض مخالفین قرآن نے اس لفظ کو بھی قرآن پر اعتراض کا بہانہ بنایا ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ چوں کہ قرآن کو اس وجہ تسمیہ کا پتہ نہیں تھا اس وجہ سے اس نے نصاریٰ کو نصرت سے ماخوذ سمجھا ہے اور سورہ صف کی اس آیت میں اسی پہلو سے ان کا ذکر کیا ہے وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ (اور یاد کرو جب کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا کہ خدا کی راہ میں میرا مددگار کون بنتا ہے، حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں) ہمارے نزدیک ان معترضین کا یہ اعتراض آیت کے مفہوم سے بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہاں قرآن مجید نے نصاریٰ کی وجہ تسمیہ نہیں بیان کی ہے بلکہ ایک امر واقعی بیان فرمایا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات اس آیت سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایک لطیف تلمیح اس بات کی طرف ہے کہ جو لوگ نصاریٰ کے نام سے موسوم ہیں انھیں حق کا مددگار ہونا چاہیے کیوں کہ اس کا اشارہ خود ان کے نام کے اندر موجود ہے۔ اس قسم کی لطیف تلمیحات انبیاء علیہم السلام کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شمعون سے جن کا لقب صفا تھا فرمایا کہ "اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پر اپنی کلیسا بناؤں گا۔ باب ۱۶: ۱۸"[1]

لفظ صابئین کی تحقیق

صَّابِئِينَ، صابئین کے متعلق اہل تاویل کے متعدد اقوال منقول ہیں۔ مجاہد اور حسن کے نزدیک یہ لوگ کسی خاص دین کے پیرو نہیں تھے بلکہ یہودیت اور مجوسیت کے بین بین تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک ان کا ذبیحہ حرام ہے۔ ابن زید کا قول ہے کہ یہ ایک مخصوص دین کے پیرو تھے اور جزیرہ موصل میں آباد تھے، ان کا عقیدہ توحید تھا لیکن نہ تو یہ کسی نبی اور کسی کتاب کے پیرو تھے اور نہ ان کے ہاں شرعی اعمال کا کوئی مخصوص نظام تھا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ملائکہ کی پرستش کرتے، قبلہ کی طرف نماز پڑھتے اور زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ ابوالعالیہ اور سفیان کے نزدیک یہ لوگ اہل کتاب میں سے ایک فرقہ تھے۔

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اقوال بظاہر متضاد نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان میں تضاد نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اول اول یہ لوگ دین حق پر تھے لیکن بعد میں یہ لوگ دین حق سے منحرف ہو کر ملائکہ اور ستاروں کی پرستش میں مبتلا ہو گئے۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح حضرت اسماعیلؑ کی اولاد پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھی لیکن بعد میں شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ قرآن مجید کی زیر بحث آیت سے مولاناؒ کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ قرآن نے اس گروہ کا جس انداز سے ذکر فرمایا ہے اس سے یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ یہ لوگ ابتداءً دین حق پر تھے، بعد میں بدعتوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہوئے۔ مولاناؒ کا قیاس

---

[1] اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن میں لفظ نصاریٰ کی تحقیق۔

یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر نماز کی عبادت معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ اسی اشتراک کے سبب سے مشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صابئین کہتے تھے۔

ان کی وجہ تسمیہ سے متعلق مولاناؒ کا خیال یہ ہے کہ چوں کہ صباء کے معنی طلوع ہونے کے آتے ہیں اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی ستارہ شناسی اور معرفت نجوم میں مہارت کے سبب سے اس نام سے موسوم ہوئے ہوں۔

چوں کہ اس مذہب کے پیرؤوں کا وجود اب کہیں باقی نہیں رہا ہے اور نہ ان کی کوئی مستند تاریخ ہی موجود ہے اس وجہ سے ان کے متعلق اعتماد سے کوئی بات کہنا مشکل ہے لیکن قرآن مجید کے زمانہ نزول میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرقہ کی حیثیت سے ان لوگوں کا وجود بالکل معروف تھا۔

۴۳۔ کیا اہل کتاب کے لیے رسول اللہ صلعم پر ایمان لانا ضروری نہیں؟

اس مجموعہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو تعلیمیں دی ہیں الفاظ اور جملوں کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان کی طرف بقدر ضرورت اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اب ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ مجموعہ کی آخری آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الایہ ۶۲ پر ہم یہاں کچھ گفتگو کریں گے اس لیے کہ اس زمانہ کے بعض متکلمین اور منکرین سنت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جو اہل کتاب اپنے اپنے صحیفوں کی تعلیمات پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کر رہے ہیں، قرآن مجید ان کی نجات کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ٹھہراتا۔ ان کے خیال میں ایسے اہل کتاب کی نجات کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے صحیفوں اور نبیوں کی تعلیم پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کریں۔ ان لوگوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں جن چیزوں سے استدلال کیا ہے ان میں البقرہ کی یہ آیت بھی شامل ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم اس آیت کا سیاق و سباق اچھی طرح واضح کر دیں تاکہ جو لوگ قصداً غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

اس آیت کو اس خیال کی تائید میں پیش کرنے کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں ان کے خیال میں مسلمان، یہود، نصاریٰ اور صابئین تمام قابل ذکر مذہبی گروہوں کا نام لے کر تصریح کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا اور عمل صالح کرتا ہے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے، اس کو نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم۔ ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کا یہی مفہوم لیا جائے تو مذکورہ فرقوں کے لوگوں کے لیے نجات حاصل کرنے کے واسطے نہ تو رسول اللہ پر ایمان لانے کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ اللہ اور آخرت کے سوا ان دوسرے اجزائے ایمان پر ایمان لانے کی ضرورت باقی رہتی ہے جن پر ایمان لانا قرآن اور حدیث میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔

لیکن اس آیت کا یہ مفہوم صرف اس صورت میں لیا جا سکتا ہے جب سیاق و سباق اس بات پر دلیل

ہو کہ یہ آیت اجزائے ایمان کی تفصیل کے لیے نازل ہوئی ہے۔ آیت کے موقع و محل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سوال، جیسا کہ ہم اوپر بھی اشارہ کر چکے ہیں، یہ نہیں ہے کہ نجات کے لیے کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور کن چیزوں پر ضروری نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں کسی کو کوئی درجہ یا مرتبہ کسی مخصوص خاندان یا فرقہ یا گروہ سے نسبت رکھنے کی بنا پر حاصل ہوتا ہے یا ایمان اور عمل صالح کی بنا پر؟ اس سوال کا جواب قرآن مجید نے یہ دیا ہے کہ یہ چیز صرف ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتی ہے، یہ کسی خاص خاندان یا کسی گروہ کا اجارہ نہیں ہے، اور مقصود اس سے یہود کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ انبیاء کے خاندان سے نسبت رکھنے کے سبب سے اپنے آپ کو وہ ایک نجات یافتہ گروہ جو سمجھنے لگے ہیں تو یہ سرتاسر ان کی غلط فہمی ہے۔ خدا سے نسبت حاصل کرنے کے لیے اصلی چیز اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق بھی پیش نظر رکھیے۔

ایک یہ کہ یہ آیت اس سورہ میں وارد ہے جس کا عمود ہی، جیسا کہ ہم شروع میں تفصیل کے ساتھ واضح کر چکے ہیں[1]، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور یہ دعوت خاص طور پر یہود ہی کے سامنے پیش بھی اسی سورہ میں کی گئی ہے۔ چنانچہ تلمیحات و اشارات سے قطع نظر خاص یہ سلسلہ کلام جس کے خاتمہ پر زیر بحث آیت وارد ہے اس طرح شروع ہوتا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ	اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ	تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے
بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ٥ وَاٰمِنُوْا	عہد کو پورا کروں گا اور مجھی سے ڈرو اور ایمان لاؤ
بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ	اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے تصدیق کرتی
وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ وَلَا	ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے
تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ	پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اور میری آیتوں کو حقیر
فَاتَّقُوْنِ (۴۰-۴۱ بقرہ)	قیمت پر نہ بیچو اور مجھی سے تقویٰ اختیار کرو۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو صریح الفاظ میں مخاطب کر کے قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس کے انکار کو صریح الفاظ میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ غور کیجیے کہ قرآن پر ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر کس طرح ممکن ہے۔ اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ جب اس آیت میں قرآن اور رسول اللہ پر ایمان نہ لانے کو کفر قرار دیا گیا ہے تو اسی سلسلہ کلام میں چند ہی آیتوں کے بعد اس مضمون کی آیت کس طرح آ سکتی ہے کہ اہل کتاب کے لیے قرآن پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو فصل ۱

بغیر بھی ان کی نجات ہوسکتی ہے۔ یہ تو نہایت بھونڈے قسم کا تضاد ہوگا جو کسی عام کتاب میں بھی سخت معیوب ہے اچہ جائیکہ قرآن حکیم میں۔

دوسری یہ کہ یہی آیت تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ مائدہ میں وارد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَ	بے شک جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور
الصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ	صابئی اور نصاریٰ، جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور
الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ	یوم آخرت پر اور اس نے عمل صالح کیا تو نہ ان پر کوئی
وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۶۹ - مائدہ ۵)	خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وہاں ٹھیک اس کے اوپر کی آیت یہ ہے:۔

قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ	کہہ دو، اے اہل کتاب تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے
حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ	جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہ کرو اور اس
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ	چیز کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی
وَلَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ	جانب سے اتاری گئی ہے اور ان میں سے بہتوں
اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّكُفْرًا ۚ	کے اندر وہ چیز جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے
فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ	اتاری گئی ہے سرکشی اور کفر کو بڑھاتی ہے تو تم اس
الْكٰفِرِیْنَ (۶۸ - مائدہ ۵)	کافر قوم کے حال پر غم نہ کرو۔

یہاں ظاہر ہے کہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ سے مراد قرآن مجید ہے جس کے تورات اور انجیل کے ساتھ قائم کرنے کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے اور جس کو قائم کیے بغیر ان کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ سرے سے خدا کے نزدیک ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے چہ جائیکہ وہ اپنے آپ کو خدا کی محبوب اور چہیتی قوم سمجھیں۔ یہاں تورات و انجیل کو قائم کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ قرآن پر اور پیغمبر آخرالزماںؐ پر ایمان لاؤ کیوں کہ ان پر ایمان لانے ہی سے وہ عہد پورا ہوگا جو ان صحیفوں میں پیغمبر آخرالزماںؐ کے بارے میں تم سے لیا گیا تھا۔

اس مضمون کی مزید وضاحت اس کی اوپر کی آیتوں سے بھی ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ	اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو
اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ	ہم ان سے جھاڑ دیتے ان کے گناہ اور ان کو نعمت
وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝ وَلَوْ	کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل
اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ	کو قائم کرتے اور اس چیز کو قائم کرتے جو ان کے رب
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا	کی جانب سے ان کی طرف اتاری گئی تو وہ اوپر اور

مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ط	نیچے ہر طرف سے خدا کا فضل پاتے۔ ان میں سے ایک
مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ط وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ	جماعت میانہ رو ہے لیکن ان میں زیادہ ایسے ہیں جن کے
سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ہ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ	عمل نہایت بُرے ہیں۔ اے رسول جو چیز تم پر تمہارے
بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَ	رب کی جانب سے اُتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا
اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَ	دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو گویا خدا کا پیغام نہیں پہنچایا
اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا	اور اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، اللہ کا فرول
يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۶۵-۶۷۔ مائدہ)	کو راہ یاب نہیں کرتا۔

اس آیت میں بھی تورات وانجیل کے قائم کرنے سے مراد درحقیقت قرآن (مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ) پر ایمان لانا اور اس کو قائم کرنا ہے کیوں کہ اس پر ایمان لانے ہی سے اس عہد کی تکمیل ہوتی تھی جو ان سے آخری پیغمبرؐ کے بارے میں تورات اور انجیل میں لیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس میں یہود و نصاریٰ کو یہ اطمینان بھی دلایا گیا ہے کہ انھیں اس بات کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر وہ قرآن پر ایمان لائے تو ان تمام دنیوی فوائد و منافع سے وہ محروم ہو جائیں گے جن سے اس وقت وہ متمتع ہو رہے ہیں۔ اگر وہ اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرنے کے لیے اپنے موجودہ مفادات سے دستکش ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دوسرے بہت سے دروازے کھول دے گا۔

تیسری یہ کہ قرآن مجید میں اس بات کی تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سے اہل کتاب میں سے خدا کی رحمت میں سے وہی اہل کتاب حصہ پائیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لیے رحمت کی دعا کی ہے تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ رحمت ان لوگوں کے لیے خاص ہو گی جو تقویٰ اختیار کریں گے۔ زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے جن کو پیغمبر آخر الزماں کی بعثت نصیب ہو گی وہ ان پر بھی ایمان لائیں گے۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً	اور ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی
وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ قَالَ عَذَابِيْٓ	لکھ دے ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ فرمایا، میں اپنا
اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ	عذاب جس پر چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں اور میری رحمت
كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ	ہر چیز کو عام ہے سو میں اس کو لکھ رکھوں گا، ان لوگوں کے
يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا	لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے
يُؤْمِنُوْنَ ہ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ	اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ یعنی جو اس رسول
النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا	نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں

عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم	اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، جو ان کو حکم دیتا ہے
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ	نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور حلال ٹھہراتا ہے ان
الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ	کے لیے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں
عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ	اور ان سے دور کرتا ہے وہ بوجھ اور پھندے جو ان
فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ	پر تھے۔ پس جو اس پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس
وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ	کی تائید اور مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے
مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝	ساتھ اتارا گیا ہے، وہی لوگ فلاح پانے والے
(۱۵۵-۱۵۶- اعراف)	ہیں۔

چوتھی یہ کہ قرآن مجید میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کے لیے ہوئی ہے اور آپ نے تمام خلق کو عموماً اور اہل کتاب کو خصوصاً اپنی نبوت پر ایمان لانے کی نہایت غیر مبہم الفاظ میں دعوت بھی دی ہے چنانچہ اہل کتاب کو خاص طور پر مخاطب کر کے آپ نے ان الفاظ میں دعوت دی ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ	کہہ دو، اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ	کر آیا ہوں۔ اس اللہ کا جس کے لیے ہی ہے آسمانوں
وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ	اور زمین کی بادشاہی۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، وہی
فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ	زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر
الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ	اور اس کے رسول نبی امی پر جو ایمان لاتا ہے اللہ اور
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝	اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم
(۱۵۷- اعراف)	راہ یاب ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نجات کے لیے جس طرح دوسروں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اہل کتاب کے لیے بھی ضروری ہے بلکہ قرآن کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے لیے دوسروں کے بالمقابل زیادہ ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے صحیفوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں اور علامتیں موجود تھیں اور ان سے ان کے نبیوں کے واسطے سے عہد لیا جا چکا تھا کہ جب آخری نبی کی بعثت ہو گی تو وہ اس پر ایمان لائیں گے اور سب سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے ان کو مخاطب کر کے یہ کہا ہے کہ تمہارا فرض منصبی اس دعوت کو قبول کرنے میں سبقت کرنا ہے، تم اس کی تکذیب میں سبقت کرنے والے نہ بنو۔

یہاں یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ اس معاملہ میں قرآن مجید نے اچھے اہل کتاب اور برے اہل کتاب میں

کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ جہاں تک نجات کا تعلق ہے دونوں ہی قسم کے اہل کتاب کی نجات کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر اہل کتاب کے صالح لوگوں کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی یہ نیکی ان کی نجات کے لیے کافی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا رویہ ان کی حق پسندی کے سبب سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اچھا تھا اور اس قسم کے سارے لوگ آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ دوسرے آسمانی مذاہب اور آسمانی صحیفوں کے بارے میں قرآن مجید کا یہ موقف ضرور ہے کہ وہ ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس تصدیق کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ان کو محفوظ مانتا ہے اور اگر ان کے پیرو نیک نیتی کے ساتھ ان کی پیروی کرتے رہیں تو یہ چیز ان کی نجات کے لیے کافی ہو جائے گی بلکہ وہ ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کے ساتھ بالکل غیر مبہم الفاظ میں یہ بات بھی کہتا ہے کہ ان صحیفوں میں بہت سی تحریفیں ہو چکی ہیں جن کے سبب سے یہ قابل اعتماد نہیں رہے۔ اب خدا کے دین کا محفوظ صحیفہ صرف قرآن ہے۔ اس کے سوا صراط مستقیم پانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد دنیا کے لیے صراط مستقیم پانے اور نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جائے اور آپ کی پیروی کی جائے۔ اس کے سوا نجات حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اس کلیہ میں اگر کسی استثنا کی گنجائش نکلتی ہے تو صرف ان لوگوں کے لیے نکلتی ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سرے سے پہنچی ہی نہ ہو لیکن اس معاملہ کا فیصلہ ہم اور آپ نہیں کر سکتے بلکہ وہ عالم الغیب ہی کر سکتا ہے جو سب کے حالات اور ہر ایک کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کون لوگ مستحق ہیں جنھوں نے حق کو ڈھونڈھنے کے لیے اپنی ذمہ داریاں ادا کیں لیکن دعوت نہ پہنچنے کے سبب سے وہ حق کو پانے سے محروم رہے۔ امید ہے کہ ایسے لوگوں کے عذر کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ان سے ان کے علم ہی کے حد تک مواخذہ فرمائے۔

۲۵۔ مسلمانوں کے لیے ایک خاص تنبیہ

آیت زیر بحث میں مسلمانوں کے لیے ایک خاص تنبیہ بھی ہے جس کی طرف یہاں توجہ دلا دینا ضروری ہے۔ اس آیت میں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد مسلمان بحیثیت ایک گروہ اور جماعت کے ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ خواہ مسلمان ہوں یا یہود یا نصاریٰ یا صابی، کوئی ہو اللہ کے ہاں بہ حیثیت ایک گروہ کے سب برابر ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی خدا کے ہاں کوئی شرف اور عزت حاصل نہیں ہے مگر ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ سے۔ صرف ایمان اور عمل صالح ہی ہے جو خدا کے ہاں تقرب اور عزت کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ اس فہرست میں سر فہرست مسلمانوں کو رکھا ہے جس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اگر بہ حیثیت ایک گروہ کے خدا کے ہاں کسی عزت کی توقع کر سکتے تھے تو مسلمان کر سکتے تھے جن کو خدا نے دنیا کی اصلاح کے لیے آخری ملت اور

خیرِ امت کی حیثیت سے مبعوث فرمایا ہے لیکن ایمان اور عمل صالح سے الگ ہو کر ان کے لیے بھی خدا کے ہاں کوئی مقام نہیں ہے۔ پھر آخر میں صابئین کا ذکر کیا ہے جن کی حیثیت ایک غیر معروف فرقہ کی تھی۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خواہ کوئی گروہ کتنا ہی گمنام اور بے حیثیت ہو لیکن اگر اس کے پاس ایمان اور عمل صالح کی دولت موجود ہو تو اس کو اللہ کے ہاں اونچا سے اونچا مقام حاصل کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

جس طرح یہود نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نسبت رکھنے کے سبب سے اپنے آپ کو خدا کی ایک محبوب قوم سمجھ رکھا تھا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایمان اور عمل صالح کی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو گئے تھے اور سمجھنے لگے تھے کہ دوزخ کی آگ صرف دوسروں ہی کے لیے ہے، ان کے لیے نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو صرف عارضی طور پر، اسی طرح مسلمان بھی امتِ مرحومہ میں ہونے کا یہ مطلب سمجھنے لگے ہیں کہ ان کے لیے تو بہر حال خدا کے ہاں معافی ہے خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں۔ یہ آیت اس قسم کے تمام توہمات کی جڑ کاٹتی ہے اور مسلمانوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ خدا کے ہاں ایمان اور عمل صالح کی کسوٹی پر سب سے پہلے جو پرکھے جائیں گے ان میں مسلمان سرِ فہرست ہیں۔

۳۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۶۳-۸۲

آگے بنی اسرائیل کو ان تمام عہد شکنیوں کی یاد دہانی کی جا رہی ہے جن کے وہ ابتدا سے خدا کی شریعت کے معاملہ میں مرتکب ہوتے رہے ہیں اور مقصود اس سے اس امر کو واضح کرنا ہے کہ کیوں وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو امامت کے منصب سے معزول کرے اور ان کی جگہ ایک دوسری امت کو اٹھائے جو اس کی شریعت کو از سرِ نو تازہ صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرے اور اس کو قائم کرے۔ یہ سلسلہ آگے دور تک جاتا ہے جس کے بیچ بیچ میں نئی برپا ہونے والی امت یعنی مسلمانوں سے مناسبِ موقع خطابات بھی ہیں لیکن یہ خطاب ضمنی ہیں۔ اصل خطاب یہود ہی سے ہے اور مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہود کی فردِ قرار دادِ جرم کو پوری تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دینا ہے۔

آیات ۶۳-۸۲

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـئِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَاِذْ
قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا
اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ
لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ
مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا
وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ ع
وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ ۚ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ
كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ
قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا
لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ
اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا
لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ

بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ
بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾
اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَ
مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا
يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ النصف
يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ
لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوْا
لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ
فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

ع ۹ ۱۱ ۹

ترجمہ آیات ۶۳ - ۸۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے تمہارا عہد لیا اور اٹھایا تمہارے اوپر طور کو، پکڑو اس
چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم
خدا کے غضب سے محفوظ رہو، پھر تم نے اس سب کے بعد اعراض کیا، تو اگر تم پر اللہ کی عنایت
اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نامرادوں میں سے ہو چکے ہوتے۔ اور ان لوگوں کا علم تو تمہیں

ہے ہی جنھوں نے سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی کی بے حرمتی کی تو ہم نے ان کو دھتکارا کہ جاؤ، ذلیل بندر بن جاؤ۔ تو ہم نے اس کو نمونۂ عبرت بنا دیا ان لوگوں کے لیے جو اس کے آگے اور پیچھے تھے اور اس کو خدا ترسوں کے لیے نصیحت بنایا۔ ۶۳-۶۶

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو تو وہ بولے کہ کیا تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے بنوں۔ انھوں نے کہا اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ واضح کرے کہ گائے کیسی ہو؟ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو، نہ بچھیا، بیچ کی راس ہو۔ تو کرو جو تمھیں حکم دیا جا رہا ہے۔ بولے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ واضح کرے کہ اس کا رنگ کیا ہو؟ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ سنہری ہو، شوخ رنگ، دیکھنے والوں کے لیے دل پسند۔ بولے اپنے رب سے دعا کرو کہ اچھی طرح واضح کر دے کہ وہ کیسی ہو، اس لیے کہ گایوں کے امتیاز میں گھپلا ہو رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ اب ہم پتہ لگا لیں گے۔ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے بگیری، زمین کو جوتنے والی اور کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہ ہو۔ بالکل یکرنگ ہو، اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ بولے، اب تم واضح بات لائے۔ پھر انھوں نے ذبح کی اور وہ ذبح کرتے نظر نہ آتے تھے۔ ۶۷-۷۱

اور یاد کرو جب کہ تم نے ایک نفس کو قتل کر دیا، پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر الزام بازی کی، حالانکہ اللہ وہ سب کچھ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپاتے رہے ہو۔ تو ہم نے کہا اس کو اس کے ایک جزو سے مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ پھر اس سب کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے، پس وہ پتھر کے مانند

ہو گئے یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خوف خدا سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۲، ۷۴

کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمھاری بات مان لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ چکنے کے بعد اس کی تحریف کرتا رہا ہے اور وہ جانتے ہیں اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، کیا تم ان کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمھارے رب کے پاس تم سے حجت کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟ کیا انھیں نہیں معلوم ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۵، ۷۷

اور ان میں اَن پڑھ ہیں جو کتاب الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ خیال کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑی سی قیمت حاصل کریں۔ پس ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر صرف گنتی کے چند دن۔ پوچھو کیا تم نے اللہ کے پاس اس کے لیے کوئی عہد کرا لیا ہے کہ اللہ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے

میں تمھیں کچھ علم نہیں۔ البتہ جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے تو وہی لوگ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۸۰-۸۲

۳۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۶۳)

میثاق کا مفہوم

مُوثِق اور میثاق کے معنی عہد و پیمان کے ہیں۔ اس لفظ کی روح وثوق اور استحکام ہے اس وجہ سے یہ خاص طور پر اس عہد و پیمان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی اہم معاملہ کے لیے پورے شعور اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کی وفاداری کا تاکید کے ساتھ اظہار و اقرار کیا گیا ہو۔ یہاں اس سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات کی پابندی کا لیا گیا۔ شریعتِ الٰہی خدا اور بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو میثاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس میثاق کا حوالہ اس طرح آیا ہے:۔

أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ۝ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱۶۹ - ۱۷۱ اعراف)

کیا ان سے کتاب کے باب میں میثاق نہیں لیا گیا کہ اللہ کی طرف نہیں منسوب کریں گے مگر حق بات اور انھوں نے اس کو اچھی طرح پڑھا جو اس میں ہے اور دارِ آخرت کی کامیابی ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کریں، تو کیا تم سمجھتے نہیں! اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں گے اور نماز قائم کریں گے (وہی لوگ مصلح ہیں) ہم مصلحوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ اور یاد کرو جب کہ ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو اس طرح اٹھا لیا گویا وہ سائبان ہے اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گر کر رہے گا۔ لو اس کو جو ہم نے تم کو دیا ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے اس کو برابر یاد رکھو تاکہ تم خدا کے غضب سے محفوظ رہو۔

پہاڑ کو سر پر لٹکانے کا مفہوم

یہ معاہدہ قرآن مجید اور تورات دونوں میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل کے سرداروں سے دامن کوہ میں لیا گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک سخت زلزلہ نے پہاڑ کو ہلا دیا۔ اگر زلزلہ کے وقت آدمی کسی اونچی دیوار کے زیر سایہ یا پہاڑ کے دامن میں بیٹھا ہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہاڑ یا دیوار سائبان کی طرح سر پر لٹک رہے ہیں اور اوپر گرا چاہتے ہیں۔ اس حالت کو قرآن نے طور کو ان کے سروں پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔

قدرت اور جلال کا مظاہرہ

یہ پہاڑ ان کے سروں پر لٹکا دینا بنی اسرائیل کو معاہدہ پر مجبور کرنے کے لیے نہیں تھا کہ اگر وہ یہ معاہدہ نہیں کرتے ہیں تو اس پہاڑ سے وہ کچل کر رکھ دیے جائیں گے۔ معاہدہ کو قبول کرنا یا نہ کرنا ایک امر اختیاری ہے۔ دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے زبردستی اور جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے یہ جو کچھ ہوا وہ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا تاکہ بنی اسرائیل اس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ شریک معاہدہ ہو رہے ہیں وہ کوئی کمزور اور بے اختیار ہستی نہیں ہے بلکہ اس کی قدرت بے پناہ ہے معاہدہ کی پابندی کی شکل میں جس طرح دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے انعامات کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح اس کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کے غضب کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ طور جیسے عظیم پہاڑ کو ان کے سروں پر لٹکا سکتا اور اس سے ان کو کچل کے رکھ دے سکتا ہے۔

اصل میثاق

خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰکُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡکُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ: یعنی اس تورات کو جو تمہارے لیے اللہ کا ایک عظیم عطیہ ہے، پوری مضبوطی اور پوری عزیمت کے ساتھ لو اور زندگی کے تمام مراحل میں پورے استقلال اور پوری پامردی کے ساتھ اس کے احکام اور اس کی ہدایات کو نباہو۔ اس کے احکام نرم بھی ہیں اور سخت بھی، نیز اس کی ذمہ داری یُسر میں بھی ہے اور عُسر میں بھی، اس وجہ سے کمزور ہاتھوں اور ڈھیلے ارادوں کے ساتھ اس کا حق ادا نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے قوت اور عزیمت مطلوب ہے۔

وَّاذۡکُرُوۡا مَا فِيۡهِ: جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو، سے مراد احکام و ہدایات بھی ہیں اور خاص طور پر وہ تنبیہات اور تہدیدات بھی جو اس میثاق کی خلاف ورزی کے نتائج سے متعلق بنی اسرائیل کو سنا دی گئی تھیں۔ تورات میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ اس عہد پر قائم رہیں گے تو وہ زمین اور آسمان دونوں طرف سے خدا کا فضل پائیں گے اور اگر انھوں نے اس کی ناقدری کی تو دنیا اور آخرت دونوں میں اس کی سزا بھی بڑی ہی سخت ہوگی۔

لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ، سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو، اس لیے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد ہی راہ تقویٰ کی نشان دہی ہوتا ہے لیکن ہم نے موقع کلام اور سیاق و سباق کی روشنی میں اس سے خدا کے قہر و غضب سے بچنا مراد لیا ہے۔ ہمارا ذہن اس طرف اس وجہ سے گیا ہے کہ اس سے پہلے ان کو خاص طور پر، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان تنبیہات و تحذیرات کو یاد رکھنے کی نصیحت کی گئی ہے جو تورات میں میثاق الٰہی کی

خلاف ورزی کے نتائج سے متعلق ان کو سنائی گئی تھیں اور ان کے سنانے سے مقصود یہی تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں خدا کے قہر و غضب سے محفوظ رہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ‌ۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَكُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (۶۴)

اسلاف کے اعمال کی نسبت اخلاف کی طرف

پھر تم اس سب کے بعد پھر گئے۔ یہ خطاب ظاہر ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے بنی اسرائیل سے ہے درآنحالیکہ یہ فعل اعراض ان کے پہلوں سے صادر ہوا تھا اور یہ لوگ اس راہ میں موجد نہیں بلکہ اپنے اگلوں کے مقلد تھے، یہ طرزِ خطاب اس حقیقت کی طرف نہایت بلیغ اشارہ کر رہا ہے کہ اگر اخلاف گمراہی یا ہدایت کے معاملہ میں ٹھیک ٹھیک اپنے اسلاف کے نقش قدم ہی پر چل رہے ہوں تو ان کی تاریخ اور ان کے اسلاف کی تاریخ گویا ایک ہی ہے۔ اسلاف کے افعال بے تکلف اخلاف کی طرف بھی منسوب ہوں گے اور اخلاف کی گمراہیوں کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوگی جب سے ان کے اسلاف نے اس برائی کی اپنے معاشرے میں طرح ڈالی۔

مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ کا ترجمہ ہم نے اس سب کے بعد کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان اور قرآن میں اس اسلوب کے استعمالات سے واضح ہوتا ہے کہ ذٰلِكَ جب اس طرح استعمال ہوتا ہے تو اوپر بیان کی ہوئی پوری سرگزشت کی طرف ایک جامع اشارہ کر دیتا ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ تورات کی پابندی کا میثاق باندھ چکنے، خدا کا جلال دیکھ لینے اور تمام تنبیہات و تہدیدات سے اچھی طرح واقف ہو چکنے کے بعد تمہارے اسلاف نے اس عہد سے منہ موڑا اور تم نے اس معاملہ میں ٹھیک ٹھیک انھی کی روش کی تقلید کی۔

فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ الآیۃ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے اعمال و افعال تو شروع ہی سے ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں دھتکار دیتا لیکن یہ محض اس کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے تمھیں آج تک مہلت دی۔ اس کے اس فضل و رحمت کا حق یہ ہے کہ اس کے شکر گزار بنو اور اپنی اس روش کو درست کرو لیکن تم اُلٹا اپنی اس روش پر فخر کر رہے ہو۔ اور اس فخر میں مبتلا ہو کر اس آخری موقع کو بھی ضائع کرنا چاہتے ہو جس کے بعد تمہارے لیے اصلاحِ حال کا کوئی موقع بھی باقی نہیں رہے گا۔

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِيۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡكُمۡ فِى السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـِٔيۡنَ (۶۵)

یہود کے نقضِ عہد کی ایک مثال

یہ اس نقضِ عہد کی ایک مثال ہے جس کا اجمالی ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت (ہفتہ) کا دن عبادت کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس دن ان کو کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو شریعتِ الٰہی کی ان پابندیوں سے آزاد کرنے کے لیے بہت سے شرعی حیلے ایجاد کر لیے۔ یہاں تک کہ سیر و شکار وغیرہ کی بھی بہت سی راہیں کھول لیں۔ اس آیت میں ان کی اسی قسم کی حرکتوں کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ یہ باتیں ان کے درمیان شہرت رکھتی تھیں اس وجہ سے قرآن نے اس کی طرف ایک معلوم و معروف حقیقت کی طرح اشارہ کر دیا ہے۔

فَقُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـِٔيۡنَ، لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی پاداش میں

ان لوگوں پر لعنت فرمائی جن لوگوں نے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں سبت کی حرمت برباد کی۔

یہود کے مسخ کی نوعیت

اہل تاویل کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس لعنت کے نتیجہ میں ان کا ظاہر بھی بندروں کے مشابہ ہو گیا تھا یا یہ مسخ صرف عقلی اور روحانی مسخ تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اختلاف کچھ زیادہ اہمیت رکھنے والا اختلاف نہیں ہے۔ انسان اور بندر کے درمیان شکل و صورت کا فرق بہت زیادہ نہیں ہے۔ اصلی فرق جو ہے وہ عقل اور ارادہ کا ہے۔ انسان کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی کوئی خواہش پوری کرتے وقت پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس خواہش کو پورا کرنا جائز بھی ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو اس کے لیے کیا شرعی اور اخلاقی حدود و قیود ہیں؟ برعکس اس کے بندر کی کسی خواہش اور اس کے فعل کے درمیان اخلاقی حدود و قیود کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی جس چیز کو اس کا نفس چاہ بیٹھتا ہے اس کو وہ فوراً کر گزرتا ہے۔ اگر یہی حالت اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں کسی انسان کی یا کسی انسانی گروہ کی ہو جائے تو اس کے درمیان اور بندر کے درمیان کوئی معنوی فرق نہیں رہ جاتا ہے۔ صرف ایک ظاہری فرق تھوڑا سا رہ جاتا ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک عقلی اور اخلاقی زوال اپنی آخری حد کو نہیں پہنچ جاتا۔ جب یہ زوال آخری حد کو پہنچ جاتا ہے تو یہ تھوڑا سا ظاہری فرق بھی بالآخر مٹ ہی کے رہتا ہے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۶۶)

'نکال' کا مفہوم

نکال کے معنی نمونہ عبرت کے ہیں۔ یہاں اشارہ اس بستی کی طرف ہے جس بستی کے لوگوں نے سبت کی حرمت برباد کرنے کے لیے وہ ناروا جسارتیں کی تھیں جن کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ کیا گیا۔ بستیوں اور مقامات کے لیے قرآن مجید میں اس طرح ایک سے زیادہ مقامات میں ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس لعنت کے نتیجہ میں یہ بستی اپنے آگے پیچھے اور گرد و پیش کی بستیوں کے لیے نمونہ عبرت بنا دی گئی جس کو دیکھ کر عقل اور خوفِ خدا رکھنے والے نصیحت حاصل کر سکتے تھے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستی سمندر کے کنارے تھی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس بستی کے لوگ تجارت اور تمدن میں بہت ترقی کر چکے تھے لیکن اس لعنت کی پاداش میں ان کے اوپر ایسا زوال آیا کہ ان کا ظاہر اور باطن سب کچھ مسخ ہو کر رہ گیا اور وہ گرد و پیش کی بستیوں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک داستانِ عبرت بن کر رہ گئے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۶۷)

یہود کے نقضِ عہد کی دوسری مثال

یہ یہود کے نقضِ عہد کی دوسری مثال بیان ہو رہی ہے اور اس مثال کو بیان کرنے کے لیے قرآن نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک ہی بات کو دو حصوں میں اس نے تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ذہنیت شروع ہی سے شریعتِ الٰہی کے قبول کرنے کے معاملہ میں کیسی حیلہ جویانہ

اور فرار پسندانہ رہی ہے' اور اس کے دوسرے حصے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہزار حیلہ وحجت کے بعد جب وہ کسی بات کو قبول بھی کر لیتے رہے ہیں تو اس کی تعمیل بھی صحیح طریقہ پر نہیں کرتے تھے بلکہ اس حکم سے گریز کی راہیں تلاش کرتے تھے۔

اس چیز کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے بنی اسرائیل کی تاریخ سے قسامہ کے ایک واقعہ کو منتخب کیا ہے' قرآن مجید کے اشارات سے واقعہ کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی شخص قتل ہوگیا، جس کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگتا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اپنی شریعت کے قانون کے مطابق اس علاقہ کے لوگوں کو جہاں قتل ہوا تھا، یہ حکم دیا کہ وہ ایک گائے کی قربانی کر کے اس پر قسمیں کھائیں۔ ان لوگوں نے اول تو اس حکم کو ماننے ہی میں لیت ولعل کیے گائے کیسی ہو، اس کا رنگ کیسا ہو، عمر کتنی ہو وغیرہ وغیرہ لیکن بہ ہزار دقت کسی طرح گائے ذبح کی بھی تو معلوم ہوتا ہے کہ قسم جھوٹی کھائی۔

یہ بات کہ شریعت موسوی میں قسامہ کا طریقہ موجود تھا، کتاب استثنا کی مندرجہ ذیل آیتوں سے ثابت ہے۔

"اگر اس ملک میں جسے خداوند تیرا خدا تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ملے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے تو تیرے بزرگ اور قاضی نکل کر اس مقتول کے گرداگرد کے شہروں کے فاصلہ کو ناپیں اور جو شہر اس مقتول کے سب سے نزدیک ہو اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو اور نہ وہ جوئے میں جوتی گئی ہو۔ اور اس شہر کے بزرگ اس بچھیا کو بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو اور نہ کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن توڑ دیں۔ تب بنی لاوی جو کاہن ہیں نزدیک آئیں کیوں کہ خداوند تیرے خدا نے ان کو چن لیا ہے کہ خداوند کی خدمت کریں اور اس کے نام سے برکت دیا کریں اور ان ہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مار پیٹ کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اس شہر کے سب بزرگ جو اس مقتول کے سب سے نزدیک رہنے والے ہوں اس بچھیا کے اوپر جس کی گردن اس وادی میں توڑی گئی، اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ ہمارے ہاتھ سے یہ خون نہیں ہوا اور نہ یہ ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔ (استثنا باب ۲۱: ۱-۸)

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا: بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم کو ایک مذاق تصور کیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ قاتل کا سراغ لگانے کے لیے یہ تدبیر بھی کوئی کارگر تدبیر ہو سکتی ہے حالانکہ جہاں سراغ لگنے کی ساری راہیں بند ہوں وہاں اگر کوئی آخری تدبیر ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ مقام قتل کے آس پاس کے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کر کے ان سے قسمیں لی جائیں اور قسم کو زیادہ سے زیادہ احترام اور تقدیس کا رنگ دینے کے لیے یہ قسم قربان کیے ہوئے جانور پر لی جاتے۔ معاہدات اور قسموں کے معاملہ میں زمانہ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ یہ عموماً معابد کے سامنے انجام دیے جاتے تھے تاکہ فریقین جھوٹ اور منافقت سے احتراز کریں۔ بعض حالتوں میں یہ طریقہ بھی اختیار کیا جاتا تھا کہ قربانی کے جانور کا خون قسم کھانے والوں پر چھڑک کر ان سے قسم لی جاتی۔ ممکن ہے

بنی اسرائیل کے ہاں بھی قسامہ کی صورت میں یہ شکل اختیار کی جاتی رہی ہو اگرچہ اوپر کے حوالے میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب امعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کی بعض صورتوں کا ذکر کیا ہے

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ، جہل کا لفظ علم کے مقابل میں بھی آتا ہے اور علم و دانش کے مقابل میں بھی۔ یہاں یہ حلم کے مقابل میں ہے مطلب یہ ہے کہ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ اللہ کے دین کے معاملہ میں کوئی ہنسی مسخری کی بات کروں، یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ خدا کا حکم ہے اور اسی میں تمھارے لیے خیر و برکت ہے، یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں گھڑی ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (۶۸)

یہود کی ایک مزاجی خصوصیت

گائے کی قربانی کے حکم کے بعد یہ سوال جو بنی اسرائیل نے کیا یہ محض ان کے فساد مزاج کا پیدا کردہ تھا، فی الواقع یہ سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان کے مزاج میں سلامت روی ہوتی تو وہ متوسط درجہ کی کوئی سی گائے ذبح کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اس ذہنیت سے واقف تھا جو اس سوال کے پس پردہ چھپی ہوئی تھی اس وجہ سے سوال کا وہ جواب تو اس نے دے دیا جو ان کے اشتباہ کے دور کرنے کے لیے کافی تھا، یعنی یہ کہ گائے اپنی عمر کے لحاظ سے اوسط درجہ کی ہو لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی بے چون و چرا تعمیل کرو، اس قسم کے سوال کر کے نہ شریعت سے گریز کی راہیں تلاش کرو اور نہ اپنے لیے دین کی وسعتوں کو تنگ کرو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ (۶۹)

گائے کے رنگوں میں سنہرا اور زرد رنگ سب سے زیادہ دل پسند رنگ ہے۔ عرب شعرا اسی پسندیدگی کے سبب سے محبوبہ کے لیے بھی یہ صفت لاتے ہیں۔ "فاقع" کا لفظ اسی رنگ کی گہرائی اور شوخی کے لیے آتا ہے۔

اوپر کا سوال بھی اگرچہ غیر ضروری تھا لیکن عمر کی ایک حد متعین ہو جانے کے بعد تو گائے سے متعلق کسی سوال کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی لیکن اس کے بعد انھوں نے رنگ سے متعلق سوال کر دیا جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اس رنگ کی گائے متعین فرمائی جس رنگ کی گائے سب سے زیادہ خوش رنگ اور پسندیدہ سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ سوال کے جواب میں سب سے زیادہ پسندیدہ رنگ ہی کی ہدایت ہونی تھی لیکن اسی طرح کے سوالات ہیں جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل نے اپنے آپ کو شریعت الٰہی کی وسعتوں اور رخصتوں سے محروم کر کے اس کو اصر و اغلال کا ایک مجموعہ بنا لیا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (۷۰)

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ

جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (۷۱)

رنگ کی وضاحت کے بعد بھی سوال کرنے والوں کی تشفی نہ ہوئی۔ انھوں نے مزید وضاحت چاہی تو ہدایت ہوئی کہ گائے کمیری نہ ہو، اس سے کھیتوں میں ہل چلانے اور پانی دینے کی خدمت نہ لی گئی ہو۔ مزید یہ ہدایت ہوئی کہ بالکل یک رنگ ہو۔ اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔

اس طرح اپنے لیے گوناگون قیدیں اور پابندیاں بڑھوا چکنے کے بعد بولے کہ ہاں اب بات اچھی طرح واضح ہوئی۔

لفظ 'حق' کا مفہوم

حق کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

وہ چیز جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔ قیامت کو اسی معنی کے لحاظ سے حق کہا گیا ہے۔

وہ چیز جو اخلاقی حیثیت سے واجب ہو۔ عدل کو اسی اعتبار سے حق کہا گیا ہے۔

وہ چیز جو جھگڑے اور اختلاف کے درمیان قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن مجید کو حق کہنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

غایت اور مقصد کے مفہوم کے لیے بھی یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ آسمان و زمین کی خلقت کو اسی معنی کے لحاظ سے بالحق کہا گیا ہے۔

جو چیز اپنے ظہور کے لحاظ سے بالکل واضح اور بیّن ہو اس کو بھی حق کہتے ہیں۔

آیت زیر بحث میں حق کا لفظ اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس آخری سوال کے ساتھ ان کی زبان سے وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (اور اب ہم ان شاء اللہ پتہ لگا لیں گے) کے الفاظ نکلے۔ یہ الفاظ ان کے باطن پر عکس ڈالتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پے در پے سوالات کے بعد خود ان پر بھی اپنے سوالات کی نامعقولیت واضح ہو چکی تھی چنانچہ ان کے اسی احساس کی شاید یہ برکت تھی کہ ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلا اور اس کلمہ کی برکت سے انھیں اس حکم کی تعمیل کی توفیق نصیب ہوئی ورنہ جس ذہنیت کا ان کی طرف سے اظہار ہو رہا تھا اس سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کبھی بھی اس حکم کی تعمیل کریں گے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۷۲)

دَرْءٌ کے معنی دفع کرنے اور پھینکنے کے ہیں۔ اسی سے تدارأتم ہے جو ادغام کے قاعدے سے اِدّٰرَءْتُمْ ہو گیا ہے۔ اس کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر الزام لگانے کے ہیں۔

ایک جملہ معترضہ

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ، (اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے جو کچھ تم چھپاتے رہے ہو) یہاں بطور جملہ معترضہ کے ہے۔ اس کے بعد کا ٹکڑا فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا (پس ہم نے کہا کہ اس کو اس کے بعض سے مارو) فادرءتم فیہا سے لگتا ہوا ہے۔ اس جملہ معترضہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو قتل کر کے تم دنیا میں ایک دوسرے پر الزام بازی

کر کے اس کو چھپانے کی کوشش کر سکتے ہو لیکن یاد رکھو کہ کوئی چیز اگر تم نے دنیا میں چھپائی تو وہ ہمیشہ چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ ایک دن اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ ظاہر کر کے رہے گا جو تم چھپا رہے ہو۔

یہ وَاِذْ قَتَلْتُمْ سے گائے کے ذبح کے حکم کا اصل مقصد بیان ہو رہا ہے۔ اوپر یہ واضح کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جو آج خدائی شریعت کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، ان کی ذہنیت اس شریعت کے قبول کرنے کے معاملہ میں کیا رہی ہے، وہ کس طرح قدم قدم پر اس کے قبول کرنے کے معاملہ میں طرح طرح کی حجتیں کرتے رہے ہیں۔ اب وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا سے آگے کے حصہ میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ گائے کے ذبح کا یہ حکم کس مقصد سے دیا گیا تھا اور اس معاملہ میں انھوں نے کیا روش اختیار کی۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۷۳)

"اس کو اس کے بعض سے مارو": عام طور پر اہل تاویل نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ مقتول کو گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا چھواؤ جس سے وہ زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ اگرچہ یہ مطلب لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے، لیکن قسامہ کے تعلق سے کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ قسم لینے کی طرف اشارہ ہو یعنی مقتول پر قربان کی ہوئی گائے کا خون چھڑکو اور آس پاس والوں سے قسم لو۔ واقعہ کی تفصیل کے بجائے اس کی طرف صرف اشارہ اس لیے کافی سمجھا گیا ہو کہ یہاں مقصود واقعہ کو بیان کرنا نہیں بلکہ بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے ایک واقعہ کو صرف جتا دینا تھا۔

یہ مطلب لینے کی صورت میں كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کا ٹکڑا بنی اسرائیل کی اس بات کا جواب ہوگا جو انھوں نے گائے ذبح کرنے کا حکم سن کر کہی تھی کہ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (کیا تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو) یعنی تمھارے نزدیک تو یہ حکم ایک مذاق ہے لیکن اگر تم اس پر اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ عمل کرو اور اس قربانی اور قسم میں ایمان داری برتو تو یہی راستہ ہے قاتلوں کے سراغ لگانے اور ان سے قصاص لینے کا جس میں سب کے لیے زندگی ہے۔

قصاص میں سب کے لیے زندگی ہے

یہ بات کہ قصاص میں سب کے لیے زندگی ہے قرآن مجید میں واضح طور پر مذکور ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۱۷۹۔ بقرہ (اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو) تورات میں بھی ایک کے قتل کو سب کا قتل اور ایک کے قصاص کو سب کی زندگی قرار دیا گیا تھا۔ قرآن مجید میں اس حکم کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا

ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا کہ جس نے کسی جان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی جان کو قتل کیا ہو یا ملک میں بدامنی برپا کی ہو اس نے گویا سب کو قتل کیا اور

اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۳۲۔ مائدہ) جس نے اس کو زندہ کیا اس نے گویا سب کو زندہ کیا۔

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر قانون قصاص کا یہ فلسفہ واضح تھا کہ قصاص نہ لینے میں سب کی موت اور قصاص لینے میں سب کی زندگی ہے۔

وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ کا تعلق اس صورت میں جملہ معترضہ سے ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں اس بات کی نشانیاں دکھا رہا ہے کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اس میں سے کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں ہے بلکہ ہر چیز ظاہر ہو کے رہے گی۔ یہ اشارہ ان باتوں کی طرف ہوگا جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی اور جن کو چھپانے کے لیے دین میں طرح طرح کی تحریفیں کیں لیکن اب وہ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہی تھیں۔ یہ اس بات کی کھلی ہوئی نشانی تھی کہ خدا سے کسی بات کو چھپانے کی کوشش ایک بے سود کوشش ہے، وہ ایک دن سارے رازوں سے پردہ اٹھا دے گا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۷۴)

دل کب سخت ہوتا ہے؟

"پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہوگئے" یہاں ثُمَّ کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ دین کے معاملہ میں تمھاری اس قسم کی کٹھ حجتیوں اور فرار پسندیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ تمھارے دل سخت ہوگئے۔ یہاں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ بنی اسرائیل نے جس طرح گائے کے ذبح کے حکم کی تعمیل میں بہت سی حجتیں پیدا کیں اسی طرح اس کے ذبح کے بعد بھی اس قربانی کا صحیح احترام ملحوظ نہیں رکھا بلکہ جھوٹی قسمیں کھا کر قاتل کو چھپانے کی کوشش کی۔ کسی جرم کے ساتھ جب حیلہ بازی اور کٹھ حجتی اور پھر مزید براں ڈھٹائی اور جسارت بھی شامل ہو جاتے تو ایسے مجرموں کے دل خدا کے قانون کے مطابق پتھر کے مانند سخت ہو جایا کرتے ہیں جس کے بعد نیکی اور تقویٰ کی روئیدگی کی صلاحیت ان کے اندر بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔

بگڑا ہوا دل پتھر سے زیادہ سخت ہوتا ہے

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (پس وہ پتھر کے مانند ہوگئے یا پتھر سے بھی زیادہ سخت) یہ اسی طرح کا اسلوب کلام ہے جیسا کہ دوسری جگہ وارد ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۱۷۹۔ اعراف) (یہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ) یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ یکسر تعبیر حقیقت ہے۔ جمادات وغیرہ میں جو سختی ہوتی ہے وہ سختی ان کو ان صلاحیتوں سے محروم نہیں کرتی جو قدرت کی طرف سے ان کے اندر ودیعت ہوتی ہیں۔ برعکس اس کے انسان اگر اپنے آپ کو بگاڑتا ہے تو اس کا بگاڑ آہستہ آہستہ قانونِ الٰہی کے بموجب ان تمام صلاحیتوں سے اس کو محروم کر دیتا ہے جو فطرت کی طرف سے اس کو ودیعت ہوئی ہوتی ہیں۔ پتھر سخت سے سخت تر ہو کر بھی پتھر ہی رہتا ہے۔ اس کی رگوں کے اندر پانی کی سوت جاری کرنے کی صلاحیت اگر قدرت نے رکھی ہوتی ہے تو اس سختی کے باوجود یہ چیز اس کے اندر باقی رہتی ہے۔ برعکس

اس کے انسان کا دل اگر کسی اخلاقی بیماری کے سبب سے سخت ہو جائے تو اس کے دل کی تمام سوتیں بالکل خشک ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بگڑے ہوئے انسان کے بگاڑ کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں کر سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ جو فرمایا کہ پتھروں میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل پڑتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خشیتِ الٰہی سے گر پڑتے ہیں۔ یہ پتھروں کی انھی فطری صلاحیتوں کی طرف اشارات ہیں جو قدرت نے ان کے اندر ودیعت کر رکھی ہیں اور جو بہر صورت باقی رہتی ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ محض کوئی شاعرانہ اسلوبِ بیان نہیں ہے جس کا واقعات کی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ یہ تلمیح ہے ان شاہدات کی طرف جو صحرا کی زندگی میں خود بنی اسرائیل کی نگاہوں کے سامنے گزر چکے تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایک چٹان سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹتے اور طور کے ایک حصہ کو تجلی الٰہی سے پاش پاش ہوتے دیکھا تھا لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی ان کے اپنے دلوں کی سختی کا یہ حال رہا کہ وہ کسی نشانی کو بھی دیکھ کر نرم نہیں ہوتے تھے۔ پھر اس بات میں شبہ کرنے کی کہاں گنجائش رہی کہ ان کے دلوں کی سختی پتھروں اور چٹانوں کی سختی سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ "اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے رہے ہو" یعنی اپنے شرف و تقدس، اپنی بڑائی اور بزرگی اور اپنی پاک دامنی کی حکایت تو دو بڑھائے جس کے کارنامے ڈھکے چھپے ہوئے ہوں اور اس کے سامنے بڑھائے جو بے خبر اور بے علم ہو، جو ہر بات سے باخبر ہو اس کے سامنے اس قسم کے دعا اور غرور سے کیا حاصل!

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ (۷۵)

ایک التفات

یہود سے خطاب کے بیچ میں یہ مسلمانوں کی طرف اسی طرح کا التفات ہے جس طرح کا التفات آیات ۶۰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور آیات ۲۱-۲۹ میں بنی اسمٰعیل کی طرف گزرا ہے۔ اس التفات کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا کہ وہ بنی اسرائیل کی مخالفت سے نہ بددل ہوں اور نہ اس پر متعجب کہ یہ پڑھے لکھے اور دین و شریعت کے عالم لوگ اس دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ذہن ایسے ٹیڑھے واقع ہوئے ہیں کہ ایک بات کو اپنے نبی کی زبان سے سننے اور اس کا مدعا واضح طور پر سمجھ چکنے کے بعد بھی اس میں ٹیڑھ پیدا کرتے رہے اور اس کو اس کے منشا کے بالکل خلاف سمت میں موڑتے رہے ہیں، جیسا کہ گائے کی قربانی کے حکم کے معاملہ میں تم نے سنا، کیا ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگوں یا ان کی تقلید کرنے والوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمھاری سیدھی سے سیدھی بات بھی سیدھے طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

دوسرا مسلمانوں کو ان یہود کی بعض پس پردہ حرکات سے آگاہ کرنا، تاکہ جو سادہ لوح مسلمان ان کے فریب کارانہ دعوائے ایمان سے دھوکے میں آکر ان سے حسنِ ظن رکھنے لگے تھے یا ان سے ربط ضبط بڑھانے کے خواہشمند تھے وہ متنبہ ہو جائیں کہ یہ تمام تر فریب کاری ہے، اس میں سچائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔

تحریف کا مفہوم اور اس کی شکلیں

يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ: حَرَّفَ الشَّئَ عن وجهه کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے صحیح رخ سے موڑ کر دوسری سمت میں کر دینا۔ اسی سے حَرَّفَ القول یا حَرَّفَ الكلام ہے جس کے معنی بات یا کلام کے بدل دینے کے ہیں۔ اس بدل دینے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

ایک بات کی دیدہ و دانستہ ایسی تاویل کر دی جائے جو قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہو۔

کسی لفظ کے طرزِ ادا اور قرأت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جو لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دے۔ مثلاً مروہ کو بگاڑ کر مورہ یا مریا وغیرہ کر دیا گیا۔

کسی عبارت یا کلام میں ایسی کمی بیشی کر دی جائے جس سے اس کا اصل مدعا بالکل خبط ہو کر رہ جائے مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے ہجرت کے واقعہ میں یہود نے اس طرح رد و بدل کر دیا کہ خانہ کعبہ سے ان کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔

کسی ذو معانی لفظ کا وہ ترجمہ کر دیا جائے جو سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً عبرانی کے ابن کا ترجمہ بیٹا کر دیا گیا درآنحالیکہ اس کے معنی بندہ اور غلام کے بھی آتے ہیں۔

ایک بات کا مفہوم بالکل واضح ہو لیکن اس کے متعلق ایسے سوالات اٹھا دیئے جائیں جو اس واضح بات کو مبہم بنا دینے والے یا اس کو بالکل مختلف سمت میں ڈال دینے والے ہوں۔

اہل کتاب تحریف کی ان تمام قسموں کے مرتکب ہوئے اور قرآن نے ان کو ان سب کا مجرم گردانا ہے۔ موقع موقع کے لحاظ سے آگے اس کتاب میں ہر ایک کی تفصیل ضروری دلائل کے ساتھ انشاء اللہ آئے گی۔ یہاں اجمال کے ساتھ صرف اس کی مختلف صورتوں کو اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تحریف پر تحریف کا اطلاق صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ دیدہ و دانستہ اور سمجھ بوجھ کر کی جائے۔ قرآن مجید نے اس کے ساتھ قید لگائی ہے مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بعد اس کے کہ انھوں نے اس کو سمجھ لیا اور وہ جانتے تھے کہ وہ تحریف کر رہے ہیں) یہی علم و شعور ہے جو درحقیقت تحریف کو ایک سنگین جرم بنا تا ہے اور اس جرم کی سزا میں اس جرم کے مرتکبین اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے نورِ علم سے یک قلم محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

یہود کے دعوائے ایمان کی حقیقت

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۷۶)

"اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں" یعنی دین و ایمان کے اجارہ دار تنہا مسلمان ہی نہیں ہیں، ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اس قول سے ان کا مطلب جیسا کہ آیات ۸، ۹ کی تفسیر

کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں، محض مسلمانوں کو دھوکا دینا ہوتا تھا۔ وہ اس قول کے ظاہر الفاظ سے مسلمانوں کو فریب دیتے تھے تاکہ مسلمان ان کے اوپر اعتماد کرنے لگیں، خود اپنے ذہن میں وہ اس کا مطلب یہ لیتے تھے کہ وہ اپنے نبیوں اور اپنے صحیفوں پر تو ایمان رکھتے ہی ہیں، ایمان اور کس چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے اس قسم کے پرفریب جملوں کے دام میں آکر ان سے کچھ اچھی امیدیں نہ لگا بیٹھیں اس لیے کہ ان کی خلوت اور جلوت کی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ سامنے تو یہ آمنّا کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب یہ اپنی خاص مجلسوں میں ہوتے ہیں تو وہاں آپس میں ایک دوسرے کا بڑی شدت سے محاسبہ کرتے ہیں۔ اگر اظہارِ رواداری کے جوش میں تمہارے سامنے ان میں سے کسی کی زبان سے غلطی سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جو اسلام کے حق میں ہوتی ہے تو یہ اپنی مجلسوں میں اس پر سختی سے گرفت کرتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کے سامنے نبی آخر الزماںؐ اور اسلام سے متعلق وہ باتیں کھولتے ہو جو خدا نے اپنے صحیفوں کے ذریعے سے صرف تم پر کھولی ہیں اور اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ تمہارے انھی بیانات کو مسلمان قیامت کے دن تمہارے خلاف شہادت اور حجت کے طور پر پیش کر سکتے ہیںؔ۔

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۷۷)، یوں تو یہ جملہ عام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے لیکن یہاں موقع کلام اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ دھوکا بازی کرتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ خدا ان کے اس آمنّا کی حقیقت سے بھی جس طرح واقف ہے جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں اور ان کی خاص مجلسوں میں آپس میں ایک دوسرے کو مسلمانوں کے سامنے افشائے راز پر جو سرزنشیں اور ملامتیں ہوتی ہیں ان کو بھی وہ خوب جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احمق لوگ مسلمانوں کے سامنے تو اپنے آپ کو ظاہرداری کے اس لبادہ میں چھپا سکتے ہیں لیکن اس خدا سے انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کیا تدبیر سوچی ہے جو ان کی خلوت و جلوت ہر جگہ موجود ہے اور جس پر ظاہر و مخفی سب کچھ روشن ہے!

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۷۸)

'اُمّی' سے مراد

اُمِّيُّوْنَ، امی کی جمع ہے جس کے معنی تحریر و کتابت اور مذہبی تعلیم سے ناواقف کے ہیں۔ اس سے مراد یہاں یہود کے ان پڑھ عوام ہیں۔

ان کے علیحدہ ذکر کرنے سے یہاں یہ بات نکلتی ہے کہ اوپر کی آیتوں میں فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ کے الفاظ سے جس گروہ کا ذکر ہوا ہے اس سے یہود کے پڑھے لکھے اور ہوشیار لوگ مراد ہیں۔ ان کی جو حرکتیں بیان ہوئی ہیں وہ بھی ہوشیاروں اور پڑھے لکھوں ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اللہ کے کلام میں تحریف کرنا اور مسلمانوں کو چکمہ دینے کی کوشش کرنا ظاہر ہے کہ عوام کالانعام کا کام نہیں ہو سکتا۔ عیاروں اور چالاکوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کا ذکر کرنے اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے مایوس کرنے کے بعد اب یہ یہود کے عوام کا ذکر فرمایا اور یہ واضح کیا کہ مسلمانوں کو ان سے بھی قبولِ حق

ؔ اس موقع پر اسی سورہ کی تفسیر آیات ۴۰-۴۶ تدبرِ قرآن میں پڑھ لینی چاہیے۔ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ایک ہی مضمون دونوں جگہ بیان ہوا ہے۔

کی توقع نہیں رکھنی چاہیے اس لیے کہ جس طرح پہلا گروہ شرارت اور حیلہ بازی میں مبتلا ہے اسی طرح یہ دوسرا گروہ بھی جھوٹی آرزوؤں اور اوہام میں مبتلا ہے۔

یہود کے عوام کی بیماری

ان کی بیماری یہ بتائی ہے کہ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ (یہ تورات کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں) اُمانی اُمنیۃ کی جمع ہے جس کے معنی آرزو، تمنا اور خواہش کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب کی اصل حقیقت سے تو کچھ واقف نہیں کہ اس میں ان کو کیا تعلیم دی گئی ہے، کیا نہیں دی گئی ہے بس ان کے ذہن میں کچھ تمنائیں اور خواہشات ہیں جو اگرچہ بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں لیکن ان کے علماء کی غلط تعلیم سے ان کے اندر بھی رچی بسی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی کتاب کو انہی انھیں خواہشات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی کتاب ان کے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتی بلکہ صرف ان کی ان خواہشات کی سند تصدیق عطا کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے ان کی اس قسم کی بعض آرزوؤں کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً:

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً (۸۰۔ بقرہ)	اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔
وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ (۱۱۱۔ بقرہ)	اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں جائیں گے مگر یہودی اور نصرانی۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔
قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ عِنْدَ اللّٰہِ خَالِصَۃً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۹۴۔ بقرہ)	کہہ دو کہ اگر آخرت کی کامیابیاں اللہ کے نزدیک دوسروں کے مقابل میں تمہارے ہی لیے مخصوص ہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔
وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ وَالنَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ (۱۸۔ مائدہ)	اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

یہ ان کی آرزوؤں میں سے صرف چند بطور مثال ذکر ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے اوہام میں مبتلا اور ایسے لذیذ خواب دیکھ رہے ہوں جن پر ذمہ داری کا (چند رسوم کی ادائیگی کے سوا) کوئی بوجھ بھی نہ ہو اور حقوق جن کے لیے سارے کے سارے خدا کے ہاں محفوظ ہوں، وہ اس قرآن پر ایمان لانے والے کس طرح بن سکتے تھے جو ان کو ان لذیذ خوابوں سے بیدار کر کے زندگی کی حقیقتوں اور اس کی اصلی ذمہ داریوں کے سامنے کھڑا کرنا چاہتا تھا۔

وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ تمام آرزوئیں محض ان کے اور ان کے علماء کے ذہن کی پیداوار ہیں، ان کو اصل حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ وَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ (۷۹)

من گھڑت فتوے

اس سورہ کے شروع میں لفظ کتاب کی تشریح کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ لفظ قرآن میں دوسرے معانی کے ساتھ شریعت کے احکام و قوانین کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ فتوے اور احکام ہیں جو علمائے یہود بغیر کسی شرعی سند کے محض اپنی دنیوی اغراض اور اپنے عوام کو خوش رکھنے کے لیے جاری کرتے تھے اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہی اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔

"اپنے ہاتھوں لکھنے" کا مطلب یہ ہے کہ ان فتووں کے لیے کتاب الٰہی کے اندر کوئی بنیاد اور سند نہیں ہوتی تھی، محض ان کے طبع زاد اور من گھڑت فتوے ہوتے تھے لیکن وہ ان کو منسوب خدا اور اس کی شریعت کی طرف کرتے تھے۔ اسی طرح کے فتوے تھے جن سے ان کے عوام شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے بے پروا ہو کر ان اوہام میں مبتلا ہوئے جن کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ ہوا ہے اور اسی راہ سے ان کے دین میں ان چیزوں کی ملاوٹ ہوئی جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (تاکہ اس کے عوض حقیر قیمت حاصل کریں) حقیر اس لیے کہ یہ دین فروشی وہ محض اپنے دنیوی اغراض کے لیے کرتے تھے اور دنیا کا بڑے سے بڑا فائدہ بھی اگر دین کو فروخت کر کے حاصل کیا جائے تو بہر حال وہ حقیر ہی ہے۔

فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ: (ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے بھی جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور اس چیز کے سبب سے بھی جو وہ اس کے عوض میں کماتے ہیں) یعنی آخرت میں یہ دونوں چیزیں ان کے لیے الگ الگ خرابی اور تباہی کا سبب بنیں گی۔ ان کا یہ اپنے جی سے شریعت تصنیف کرنا بھی سبب تباہی اور اس کے عوض میں دنیوی منافع حاصل کرنا بھی موجب تباہی!

وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۸۰)

جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال

"اور وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔" یہ ان جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ یہود اپنے لیے کسی صورت میں ابدی عذاب دوزخ کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے جنت و دوزخ کو اعمال کا نتیجہ اور اعمال پر مبنی سمجھنے کے بجائے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ خدا کی برگزیدہ امت ہیں اس وجہ سے خواہ ان کے اعمال کچھ ہوں، اول تو وہ دوزخ میں بھیجے ہی نہیں جائیں گے اور اگر بھیجے بھی گئے تو معمولی طور پر کچھ سزا بھگت کر جنت کو واپس کر دیئے جائیں گے۔ ان کے اس واہمہ نے ان کے عوام اور خواص سب کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بالکل بے پروا کر دیا۔ نجات کے معاملہ میں ان کا سارا اعتماد عمل اور عقیدہ کے بجائے اپنی گروہی نسبت پر رہ گیا تھا اور بدقسمتی سے ہم مسلمان بھی کچھ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ "یا تم اللہ کی طرف وہ بات منسوب کر رہے ہو جو جانتے نہیں" "جانتے نہیں" یعنی جس کی سند تمھاری کتاب میں موجود نہیں، بس ایک بات تم نے اپنے جی سے گھڑ کر اپنے خدا کی طرف منسوب

کردی ہے، حالانکہ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تم خدا کی طرف حق بات کے سوا کوئی بات منسوب نہیں کروگے۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (۱۶۸ - اعراف)

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۱)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۲)

یہود کے واہمہ کی تردید

یہ یہود کے اس واہمہ کی تردید ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ یعنی جنت اور دوزخ کا تعلق خاندانی اور گروہی نسبتوں سے نہیں بلکہ تمام تر عمل سے ہے، جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے اور وہ برائی اس کو اپنے گھیرے میں لے لے تو اس کے لیے خلود فی النار ہے خواہ اس کا تعلق کسی گروہ سے ہو، برعکس اس کے جو شخص ایمان اور عمل صالح کی روش پر قائم رہے اس کے لیے خلود فی الجنۃ ہے خواہ اس کا تعلق کسی خاندان سے ہو۔

جس طرح اس سورہ کے پہلے سلسلۂ بیان کے خاتمہ پر اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا الآیۃ والی آیت وارد ہوئی تھی اسی طرح اس دوسرے سلسلہ بیان کے خاتمہ پر یہ بَلٰى مَنْ كَسَبَ الآیۃ والی آیت وارد ہوئی ہے۔ ان دونوں آیتوں کا موقع اور مقصد بالکل ایک سا ہے اس وجہ سے ان دونوں کو ایک دوسرے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آگے مناسب مقام پر اس کی مزید شرح آئے گی۔

۳۸- آگے کا مضمون ——— آیات ۸۳-۹۶

یہود کے لیے، قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے معاملہ میں جو چیز حجاب بن گئی تھی وہ ان کا یہ گھمنڈ تھا کہ وہ خود کتاب اور شریعت کے حامل ہیں اور ایک ایسے برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کو خدا نے دینی و مذہبی پیشوائی اور دنیا و آخرت دونوں میں اپنی محبت و محبوبیت کے لیے خاص کر لیا ہے۔ ایک ایسا برگزیدہ گروہ اوّل تو اس بات کا محتاج ہی کب ہے کہ وہ کسی اور کتاب و شریعت پر ایمان لائے۔ ثانیاً اس کے سوا کسی اور کو اللہ تعالیٰ کتاب و شریعت دے کس طرح سکتا ہے؟

یہود کے استکبار پر ضرب

قرآن نے یہاں پہلے ان کے اس استکبار پر ضرب لگائی اور فرمایا کہ وہ اپنے آپ کو کتاب و شریعت کا جو حامل سمجھتے ہیں وہ محض ایک خیال باطل ہے، اس لیے کہ ان سے خدائے واحد ہی کی عبادت، والدین، اقربا، اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک، نماز اور زکوٰۃ کی پابندی اور اپنے بھائیوں کی نصرت و حمایت کا جو ابتدائی عہد لیا گیا تھا اس کو انھوں نے توڑ ڈالا اور اس عہد کی تجدید اور یاددہانی کے لیے جو انبیاء بھیجے گئے ان کی بھی یا تو انھوں نے تکذیب کی یا ان کو قتل کر ڈالا۔ ایسی صورت میں ان کا یہ دعوٰے کہ وہ کتاب و شریعت کے حامل ہیں، کیا وزن رکھتا ہے؟

یہود کی ضد

اس کے بعد فرمایا کہ یہ قرآن ان پیشین گوئیوں کے مطابق نازل ہوا ہے جو ان کے صحیفوں میں موجود ہیں اور یہ اس کے منتظر بھی رہے ہیں۔ لیکن اب جب کہ یہ موعود و منتظر چیز ان کے پاس آگئی اور انھوں نے اس کو

پہچان بھی لیا ہے تو محض اس ضد کے سبب سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کے ایک فرد پر کیوں اتارا، ان کے اندر کے کسی فرد پر کیوں نہ اتارا۔

یہود کے دعوائے ایمان کی حقیقت

اس کے بعد ان کے دعوائے ایمان کی مزید قلعی کھولی ہے کہ یہ اپنے جس ایمان پر اس قدر نازاں ہیں کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لا رہے ہیں، اس ایمان کا حال شروع سے یہ رہا ہے کہ انھوں نے عین موسیٰ کی موجودگی میں گوسالہ پرستی کی اور بعد کے زمانوں میں یہ اللہ کے نبیوں کی تکذیب بھی کرتے رہے اور ان میں سے بعض کو انھوں نے قتل بھی کر دیا۔

یہود کے خلاف خود ان کے ضمیر کی شہادت

پھر ان کے اس زعم کے خلاف کہ آخرت کی تمام سرفرازیاں صرف انھیں کا حصہ ہیں اس لیے کہ وہی خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں، خود ان کے باطن کی یہ شہادت پیش کی ہے کہ اگر وہ اپنے اس زعم میں سچے ہیں تو زندگی کے اتنے حریص کیوں بنے بیٹھے ہیں۔ پھر تو انھیں زندگی کے بجائے موت کا حریص ہونا چاہیے۔

یہ پوری تقریر جس کا ہر حصہ باہمدگر بالکل مربوط ہے بنی اسرائیل کے سامنے یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے کی گئی ہے کہ قرآن کی مخالفت کے لیے انھوں نے جو پہلو اختیار کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں صرف قومی نخوت، ہٹ دھرمی اور حسد پر مبنی ہیں۔

اس تقریر میں کچھ باتیں تو بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہی گئی ہیں۔ کچھ ان سے منہ پھیر کر کہی گئی ہیں اور بعض باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلائی گئی ہیں۔ تخاطب کے یہ مختلف اسلوب بلاغت کے تقاضوں کے تحت ہیں۔ جو شخص ان آیات کی تلاوت تدبر کے ساتھ کرے گا وہ انشاءاللہ خطاب کی ان تبدیلیوں کی خوبیاں خود سمجھ جائے گا، یہ ذوق سے تعلق رکھنے والی چیزیں بیان کی گرفت میں مشکل سے آتی ہیں۔

ان مطالب کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے اب ان آیات کی تلاوت فرمایئے ارشاد ہوتا ہے:

آیات ۸۳-۹۶

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن

يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ
بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ
مِنْكُمْ اِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى
اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا
هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ
بِالرُّسُلِ ؗ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا
كَذَّبْتُمْ ؗ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ
بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ
مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾ بِئْسَمَا
اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ

مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَ
اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ
اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ
الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى
حَيٰوةٍ ۚۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ معانقة ۲
سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۱

ترجمہ آیات ۸۳-۹۶

اور یاد کرو جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے والدین کے ساتھ احسان کرو گے۔ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں کو ان کا حق دو گے اور یہ کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم برگشتہ ہو گئے مگر تم میں سے بہت تھوڑے لوگ۔ اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو۔ ۸۳

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے اقرار لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے ان باتوں کا اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر تم ہی لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو۔ پھر اگر وہ تمہارے پاس

قیدی ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ سرے سے ان کا نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا۔ کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصّہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصّے کا انکار کرتے ہو؟ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی تو نہ تو ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی۔ ۸۴-۸۶

اور ہم نے موسٰی کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسٰی بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی تو کیا جب جب آئے گا کوئی رسول تمہارے پاس وہ باتیں لے کر جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی تو تم تکبّر کرو گے؟ سو تم نے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے تو شاذو نادر ہی وہ ایمان لائیں گے۔ ۸۷-۸۸

اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے؛ تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانتے پہچانتے ہوئے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ کیا ہی بُری ہے وہ چیز جس سے اُنھوں نے اپنی جانوں کا مبادلہ کیا کہ وہ انکار کر رہے ہیں اس چیز کا جو اللہ نے اتاری ہے محض اس ضد کی بنا پر کہ اللہ نازل کرے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے۔ پس وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر لوٹے اور منکروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۸۹-۹۰

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس چیز پر تو ہم ایمان رکھتے ہی ہیں جو ہم پر اتری ہے اور وہ اس کے علاوہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہی حق ہے اور مطابق ہے ان پیشین گوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں۔ ان سے پوچھو پھر تم خدا کے پیغمبروں کو اس سے پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو اگر تم مومن ہو۔ اور موسیٰ تمھارے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۹۱-۹۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا اور تمھارے اوپر طور کو اٹھایا اور حکم دیا کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو اور مانو۔ انھوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑے کی پرستش ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔ ان سے کہو کہ اگر تم مومن ہو تو کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کا تمھارا ایمان تم کو حکم دیتا رہا ہے۔ ۹۳

ان سے کہو کہ اگر دار آخرت کی کامیابیاں اللہ کے ہاں دوسروں کے بالمقابل تمھارے ہی لیے مخصوص ہیں تو موت کی آرزو کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ مگر یہ اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے جن کے یہ مرتکب ہوئے ہیں کبھی موت کی تمنّا نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ۹۴-۹۵

اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے، ان لوگوں سے بھی زیادہ جنھوں نے شرک کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار سال عمر ملے حالانکہ اگر یہ عمر بھی ان کو ملے تو بھی وہ اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے والے نہیں بن سکتے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ ۹۶

۳۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸۳)

بنی اسرائیل سے ابتدائی عہد

یہ اس ابتدائی عہد کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے شرک سے اجتناب، والدین کے ساتھ حسن سلوک اعزا و اقربا اور یتامیٰ و مساکین کے حقوق کی ادائیگی اور نماز و زکوٰۃ کے قیام سے متعلق لیا گیا۔ اس میں سب سے پہلے لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ کا ذکر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو گے۔ یہ جملہ اگرچہ ہے تو بظاہر خبر کے قالب میں لیکن معنی میں ہے نہی کے۔ اس وجہ سے بعد کے انشائیہ جملوں کا عطف اس کے اوپر موزوں ہوا۔

خدا کے بعد سب سے بڑا حق

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: اللہ تعالیٰ کے حق کے بیان کے بعد یہ معاً والدین کے حق کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اگر کوئی ہے تو ماں باپ ہی کا ہے اور کسی کا بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ حق صرف احسان یعنی حسن سلوک کا متقاضی ہے عبادت کا نہیں۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عبادت میں والدین کو شریک کرنے کی اجازت نہیں دی جن کا درجہ خدا کے بعد سب سے اونچا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

وَذِي الْقُرْبٰى، کو احسان کے تحت بھی رکھ سکتے ہیں جس کا ذکر والدین کے لیے ہوا ہے اور اس کے لیے کوئی دوسرا مناسب فعل محذوف بھی مان سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان دونوں ہی شکلوں کے لیے نظیر موجود ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا وَّ	اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا کسی کو ساجھی نہ
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَ	ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور
الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ (۳۶- النساء)	قرابت مندوں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔

اس آیت میں وَبِذِي الْقُرْبٰى کو اِحْسَانًا کے تحت ہی رکھا ہے لیکن دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ	اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نہ بندگی کرو
اِحْسَانًا ...... وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى	مگر اس کی۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک
حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	کرو .... اور قرابت مند اور مسکین اور مسافر
(۲۳- بنی اسرائیل)	کو اس کا حق دو۔

احسان اور ادائے حقوق

یہاں والدین کے لیے احسان اور ذی القربیٰ اور مسکین و مسافر کے لیے ایتائے حق کے الگ الگ فعل

استعمال کیے ہیں۔ ان دونوں مواقع کو ملانے سے یہ بات نکلتی ہے کہ احسان درحقیقت نام ادائے حقوق ہی کا ہے۔ اگر حقوق نہ ادا کیے جائیں تو محض خالی خولی باتوں سے احسان کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔

وَالْيَتَامٰى وَالْمَسٰكِيْنَ: حقوق کی ترتیب میں والدین، پھر اقربا اور ان کے بعد فوراً ہی تیامیٰ اور مساکین کا ذکر اس اہمیت کو ظاہر کرتا ہے جو اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام میں تیامیٰ اور مساکین کو حاصل ہے۔ اسلامی نظام میں ہر صاحب استطاعت پر اس کے والدین اور اقربا کے حقوق کے بعد یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ہیں جن کو ادا کیے بغیر کوئی شخص اسلام کی عائد کی ہوئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

ان حقوق کے لیے حقوق کا لفظ ہم نے اپنی طرف سے صرف ایک استعارہ کے طور پر نہیں استعمال کیا ہے بلکہ یہ لفظ خود قرآن مجید نے استعمال کیا ہے اور اسلامی نظام میں حقوق ہی کی حیثیت سے ان کی حفاظت بھی کی گئی ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا مفہوم

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (اور لوگوں سے اچھی بات کہو) اس ٹکڑے کا ایک تو وہ عام مفہوم ہے جو اس کے ظاہر الفاظ سے نکلتا ہے، اس اعتبار سے نیکی و شرافت اور پند و نصیحت کی ہر وہ بات اس کے تحت داخل ہو گی جس کی تعلیم و تبلیغ کی ہر موقع پر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کو عام رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے اہل تاویل نے اس کو عام ہی رکھا بھی ہے۔ لیکن بعینہٖ یہ بات اسی سیاق و سباق میں تھوڑے سے الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں بھی کہی گئی ہے۔ ان تمام آیتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سیاق میں یہاں یہ الفاظ وارد ہیں ان کا ایک خاص مفہوم بھی ہے جس سے قرآن کے ایک طالب علم کو بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ ہم یہاں تمام ہم معنی آیات جمع کر کے اس خاص مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

سورہ نساء میں یتیموں سے متعلق ان کے اولیاء کی بعض ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۵۔ نساء)	اور تم ناسمجھ یتیموں کے حوالہ اپنے وہ مال نہ کرو جس کو اللہ نے تمہارے معاشی قیام و بقا کا وسیلہ بنایا ہے۔ البتہ تم اس مال سے ان کو فراغت کے ساتھ کھلاؤ اور پہناؤ اور معروف طریقہ پر ان کی دلداری کرتے رہو۔

اسی سورہ نساء میں دوسری جگہ فرمایا۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ	اور اگر تقسیم میراث کے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور معروف طریقہ پر ان سے دلداری کی

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا (۹۔ نساء)

بات کریں۔ اگر یہ اپنے پیچھے کمزور اولادیں چھوڑتے تو ان کے بارے میں ڈرتے تو انھیں چاہیئے کہ اللہ سے ڈریں اور معقول بات کہیں۔

آگے اسی سورۂ بقرہ میں ہے۔

اَلَّذِينَ يُنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا اَنْفَقُوا مَنًّا وَّلَا اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ (۲۶۲-۲۶۳- بقرہ)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اپنے اس خرچ کے پیچھے اظہار احسان اور ایذا رسانی کی بلا نہیں لگا دیتے ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے نہ ان کے لیے خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دستور کے مطابق دلداری کا ایک کلمہ اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری کی بلا لگی ہوئی ہو۔ اللہ بڑا بے نیاز اور حلیم ہے۔

انفاق ہی کے سلسلہ میں سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا۔

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا (۲۸۔ بنی اسرائیل)

اگر تم کو اپنے رب کے کسی فضل کے انتظار میں جس کے تم متوقع ہو ان سے اعراض ہی کرنا پڑے تو ان سے نہایت نرم بات کہو۔

ان تمام آیات پر غور کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہاں قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کے الفاظ میں وہی بات کہی گئی ہے جو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے متعلق اوپر کی آیات میں کہیں وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا کے الفاظ میں اور کہیں وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا اور قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ وغیرہ کے الفاظ میں کہی گئی ہے۔

قرآن مجید نے والدین، اقربا، یتامیٰ اور مساکین سے متعلق ایک طرف حسن سلوک اور ادائے حقوق کی تاکید کی ہے، دوسری طرف اس امر کی ہدایت کی ہے کہ ان کے ساتھ بات شریفانہ انداز میں کی جائے۔ ان کے خلاف دل میں برہمی ہو تو اس کو ضبط کیا جائے اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اخلاق کے بغیر کوئی شخص ان کے حقوق و فرائض سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بسا اوقات آدمی ان کی حاجت کی کمزوری کی بنا پر ان کی عزت نفس ملحوظ رکھنے میں کوتاہی کر جاتا ہے جس سے ان کے مجروح دل اور زیادہ زخمی ہو جاتے ہیں، بعض اوقات آدمی کے دل میں ان کے خلاف کوئی رنجش ہوتی ہے جو ان کو مجبور اور بے بس پا کر زیادہ کرخت انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ بعض حالات میں خود ان ضرورت مندوں کا رویہ بھی کچھ ناگوار سی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ چیز بھی آدمی کے لیے ترش کلامی کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن نے ان تمام چیزوں سے

روک کر ان سے اچھے انداز میں بات کرنے کی ہدایت کی ہے اور تسلی و تسکین کے ایک کلمہ کو اس خیرات سے بھی بہتر قرار دیا ہے جس کے ساتھ تلخ کلامی، توہین اور دل آزاری شامل ہو۔ اسی بات کو یہاں قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن سیاق کلام اور نظم دلیل ہے کہ مفہوم یہی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ سے تمام نیکیوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ: (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) یہاں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا ذکر تفصیل کے بعد اجمال کی نوعیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ دونوں چیزیں اوپر کی تمام باتوں کو اپنے اندر سمیٹ لینے والی ہیں۔ اوپر اللہ ہی کی عبادت کرنے، نیز اعزا و اقربا اور مساکین و یتامیٰ کے ساتھ حسن سلوک کی جو ہدایت کی گئی ہے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ان تمام نیکیوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اجزا کے ذکر کے بعد ان اصولی چیزوں کا بھی ذکر کر دیا، جس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو رہی ہے کہ اگر تم نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے تو تمہارے لیے اوپر بیان کی ہوئی نیکیوں کا انجام دینا آسان رہے گا اور اگر نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر دو گے تو پھر سب کچھ ضائع کر بیٹھو گے۔

ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ: (پھر تم نے منہ موڑ لیا مگر تم میں سے تھوڑے لوگ اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو) یہی وہ بات ہے جس کو واضح کرنے کے لیے اوپر کے میثاق کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ یعنی یہ عہد جو اتنے اہتمام سے تم نے باندھا، تم نے اس کو توڑ تاڑ کے رکھ دیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ تم میں سے ایسے نکلے جو اس پر استوار رہ سکے۔

یہود کی مزاجی خصوصیت کی طرف ایک اشارہ

قرآن مجید نے یہاں ان کی اس عہد شکنی کو پہلے فعل کی شکل میں بھی بیان کیا ہے اور پھر وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ کہہ کر اس کو ان کی ایک مستقل صفت کی حیثیت سے بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے جو ان سے اتفاقی طور پر صادر ہو گیا ہو بلکہ یہ اعراض و انحراف ان کے قومی مزاج کی ایک خصوصیت بن چکا ہے۔ قرآن مجید نے ان کی جس مزاجی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے۔ انھوں نے بار بار بنی اسرائیل کی نافرمانیوں پر ان کو ملامت کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ تم بڑے ہی سرکش اور گردن کش لوگ ہو۔

یہاں نظم کلام کی اس حقیقت کو ذہن سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ بنی اسرائیل کو اس نقض عہد کی یاد دہانی ان کے اس پندار پر ضرب لگانے کے لیے کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کتاب الٰہی کا امین، شریعت خداوندی کا حامل اور اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی و اخروی نعمتوں کا واحد اجارہ دار سمجھے ہوئے بیٹھے تھے اس وجہ سے نہ تو نئی نبوت و رسالت کی ضرورت کے قائل تھے اور نہ اپنے دائرے سے باہر کی کسی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کے لیے تیار تھے۔ ان لوگوں کو اس آیت میں نیز اس کے بعد والی آیتوں میں یہ یاد دہانی کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عہد و میثاق ان سے لیا تھا اور جس پر ان کو اس قدر فخر و ناز ہے اس عہد و میثاق کی انھوں نے کس طرح دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۸۴)

ایک اور عہد کا حوالہ

یہ ایک اور عہد کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ یہ عہد اس بات کے لیے تھا کہ یہ آپس میں نہ تو ایک دوسرے کا خون بہائیں گے اور نہ اپنے بھائیوں کو ان کے گھروں سے جلاوطن کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن انھوں نے جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے اس عہد کو بھی نہایت بے دردی سے پامال کیا۔

اسلاف کے عہد کی ذمہ داری اخلاف پر

اس عہد کی اہمیت واضح کرنے کے لیے فرمایا ہے ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۔ جس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں اور دونوں سے اس کی اہمیت اور اس کے نقض کی شناعت واضح ہوتی ہے۔ ایک مفہوم تو، جیسا کہ عام مفسرین نے لیا ہے، یہ ہے کہ تم کو اس عہد کا اقرار ہے اور تم آج بھی اس کے گواہ ہو اس لیے کہ اس کا ذکر تورات میں موجود ہے اور اس کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ تم نے اس عہد کا اقرار کیا اور تم اس اقرار کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود تھے۔

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے ہمیشہ پوری جماعت کے سامنے آگاہ کرتے اور پھر پوری جماعت سے ان احکام کی اطاعت اور پابندی کا اقرار لیتے تاکہ اس جماعتی اقرار سے لوگوں کے اندر اس کی پابندی کا احساس پوری اہمیت حاصل کرلے اور نسلاً بعد نسل ان کے اندر یہ روایت زندہ رہے کہ اس عہد کا اقرار ہم نے فلاں جگہ من حیث الجماعت کیا ہے۔ یہاں قرآن نے اپنے زمانۂ نزول کے بنی اسرائیل کو یاد دلایا ہے کہ تم اپنے جن آباؤ اجداد کی روایات پر فخر کرتے ہو، جب ان کی پوری جماعت کا یہ اقرار تمھاری کتاب میں موجود ہے تو تم اس کی ذمہ داری سے کس طرح انکار کر سکتے ہو۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۸۵)

ایک طرف دین کی مخالفت دوسری طرف دینداری کا مظاہرہ

یعنی جس عہد کو تم نے اس اہتمام کے ساتھ باندھا اب تم ہی لوگ ہو کہ اس کو اس سرگرمی کے ساتھ توڑ رہے ہو۔ اس توڑنے کی شکل یہاں قرآن مجید نے یہ بیان کی ہے کہ تم اپنے بھائیوں کے خلاف ان کے دشمنوں سے سازباز کرتے ہو اور پھر ان کے مددگار بن کر اپنے بھائیوں کو ان کی بستیوں سے جلاوطن کراتے ہو۔ اس طرح ان کو ذلیل وخوار کرا لینے کے بعد جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں قیدی ہو کر تمھارے پاس آتے ہیں تو تم اپنی ملت پروری اور قوم دوستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ان کو فدیہ دے کر چھڑاتے بھی ہو کہ یہ تورات کا حکم ہے، حالانکہ تورات میں جس طرح یہ فدیہ دے کر چھڑانے کا حکم ہے، اسی طرح یہ ممانعت بھی موجود ہے کہ اپنے بھائیوں کو ان کی بستیوں سے نہ نکالنا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہودیہ اور اسرائیل کی سلطنتیں الگ الگ قائم ہو جانے کے بعد سے بنی اسرائیل میں اس طرح کے واقعات بہت پیش آئے۔ دونوں سلطنتوں کے درمیان حریفانہ کاوشیں رہتیں اور ایک دوسری سے انتقام لینے کے لیے آسان نسخہ یہی ہوتا کہ مخالف طاقتوں کو ابھار کر ان سے حریف پر چڑھائی کرادی جائے اور جب وہ قتل و نہب کے بعد دشمنوں کے ہاتھوں میں اسیر ہو کر طالب [1] ہوں تو ان کو چھڑا کر قومی ہمدردی و بہی خواہی کی دھونس بھی عوام پر جمائی جائے۔

اسی طرح کے حالات ان یہودیوں کے بھی تھے جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں عرب میں آباد تھے۔ ان کی مختلف شاخوں نے انصار کی مختلف شاخوں کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے، مثلاً بنو قینقاع اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اوس کے۔ اوس اور خزرج کے درمیان برابر قبائلی جنگیں برپا رہتیں۔ اور ان جنگوں میں یہود بھی اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ شریک ہوتے اور بھائیوں کے قتل اور ان کی جلا وطنی کا سبب بنتے لیکن اس برادر کشی کے ساتھ ساتھ اپنی دینداری کی نمائش کے لیے یہ بھی کرتے کہ جب ان کے دینی بھائی دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہوتے تو ان کو فدیہ دے کر چھڑاتے بھی کہ یہ تورات کا حکم ہے [1]

ایک طرف اللہ کے دین کی یہ مخالفت اور دوسری طرف دینداری کا یہ مظاہرہ صریح منافقت ہے کیونکہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کتابِ الٰہی کی جو بات اپنی خواہشات کے مطابق ہو وہ تو مانی جائے اور جو بات خواہشات کے خلاف ہو اس کا انکار کر دیا جائے۔ اس طرح کا من مانا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے جو لوگ شریعت الٰہی کے معاملہ میں یہ رویہ اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں بھی رسوا کرتا ہے اور ایسے لوگ آخرت میں بھی سخت عذاب کے مستحق ہوں گے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (٨٦)

لفظ اشتراء کا مفہوم

یہاں اشتراء کے معنی خریدنے یا بیچنے کے نہیں بلکہ مجرد ترجیح دینے کے ہیں۔ آدمی جب ایک شے کو قیمت دے کر خریدتا ہے تو اس کو قیمت کے بالمقابل ترجیح دیتا ہے۔ لسان العرب نے آیت أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ سے متعلق ابو اسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہاں بیع و شرا مراد نہیں ہے بلکہ محض اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ جس طرح ایک مشتری اپنا مال دے کر اپنی مطلوب و مرغوب چیز لیتا ہے اسی طرح ان کفار نے ضلالت کو اپنی ایک مرغوب و محبوب چیز کی طرح پکڑ لیا ہے۔ اہل عرب ہر اس موقع پر جب ایک چیز چھوڑ کر دوسری چیز اختیار کی جائے، کہیں گے اشْتَرَاهُ اس نے اس چیز کو خریدا یعنی اس کو ترجیح دی۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال ہوا ہے۔

---

[1] ان آیات کی تلاوت کرتے وقت مسلمان حکومتوں اور مسلم جماعتوں کی ان سازشوں پر بھی نگاہ رہے جو وہ ایک دوسرے کے خلاف کرتی رہتی ہیں اور اس معاملہ میں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرنے میں بھی ان کو کوئی عار نہیں ہوتا۔

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ: نہ تو ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی یعنی نہ تو ان کے ساتھ اندر سے کوئی رعایت کی جائے گی اور نہ باہر سے ان کو کوئی مدد حاصل ہو سکے گی۔ اللہ کے اس ابدی عذاب میں گرفتار ہو جانے کے بعد ان کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۸۷)

عہد کی یاددہانی کا انتظام

اوپر والے عہد کی برابر یاددہانی کراتے رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو کتاب دینے کے بعد اس کتاب کی تذکیر کے لیے برابر انبیا بھیجے گئے اور خاص کر عیسیٰ بن مریم کو اللہ تعالیٰ نے "بَیِّنٰت" کے ساتھ بھیجا۔ "بَیِّنٰت" سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے اور جو اس قدر واضح تھے کہ ان کے خدا کی طرف سے ہونے میں کوئی ہٹ دھرم ہی شک کر سکتا تھا لیکن یہود نے ان کھلے کھلے معجزات کو بھی تائید ربانی اور فیضِ روح القدس کا نتیجہ قرار دینے کے بجائے نعوذ باللہ شیطانی تصرف کا نتیجہ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ معجزے شیطانوں اور بھوتوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ قرآن مجید نے یہود کے اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بار بار یہ فرمایا ہے کہ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے روح القدس سے اس کی مدد کی) یعنی اس سے جو معجزے صادر ہوئے یہ تائید روح القدس کا نتیجہ ہیں نہ کہ کسی شیطان یا جن کی مدد کا، جیسا کہ یہود سمجھتے ہیں۔

تائیدِ روح القدس کا مفہوم

انجیل میں یہود کے اس الزام کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اور ان کے اس الزام کا جو جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیا ہے وہ بھی نقل ہوا ہے۔ ہم یہاں ایک اقتباس متی سے پیش کرتے ہیں جس سے اس خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ متی باب ۱۲ میں ہے۔

> اس وقت اس کے پاس لوگ ایک اندھے گونگے کو لائے جس میں بدروح تھی اس نے اسے اچھا کر دیا چنانچہ وہ گونگا بولنے اور دیکھنے لگا اور ساری بھیڑ حیران ہو کر کہنے لگی کہ کیا یہ ابن داؤد ہے۔ فریسیوں نے سن کر کہا یہ بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔ اس نے ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا۔ اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر اس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی۔ اور اگر میں بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو تمہارے بیٹے کس کی مدد سے نکالتے ہیں۔ پس وہی تمہارے منصف ہوں گے لیکن اگر میں خدا کے روح کی مدد سے بدروحوں کو

نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمھارے پاس آپہنچی۔ یا کیوں کر کوئی آدمی کسی زور آور کے گھر میں گھس کر اس کا اسباب لوٹ سکتا ہے جب تک کہ پہلے اس زور آور کو نہ باندھ لے۔ پھر وہ اس کا گھر لوٹ لے گا۔ جو میرے ساتھ نہیں وہ میرے خلاف ہے۔ جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا وہ بکھیرتا ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ آدمیوں کا ہر گناہ اور کفر تو معاف کیا جائے گا مگر جو کفر روح کے حق میں ہے وہ معاف نہ کیا جائے گا۔ اور جو کوئی ابن آدم کے برخلاف کوئی بات کہے گا تو وہ معاف کی جائے گی لیکن جو کوئی روح القدس کے خلاف کوئی بات کہے گا وہ معاف نہ کی جائے گی، نہ اس عالم میں اور نہ آنے والے عالم میں۔ یا تو درخت کو بھی اچھا کہو اور اس کے پھل کو بھی اچھا۔ یا درخت کو بھی برا کہو اور اس کے پھل کو بھی برا، کیونکہ درخت پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ (متی باب ۱۲۔ آیات ۲۲-۳۳)

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے الفاظ پر غور کیجیے تو آیت کا اصلی زور سمجھ میں آجائے گا کہ اس میں کس بات کا اثبات اور کس بات کی تردید ہے۔ جہاں تک روح القدس کی تائید کا تعلق ہے وہ ہر پیغمبر کو حاصل ہوتی ہے اور پیغمبر سے جو معجزات صادر ہوتے ہیں وہ اسی تائید کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں اس بات کا اظہار بار بار اس لیے فرمایا گیا کہ یہود ان پر مذکورہ بالا الزام لگاتے تھے۔ روح القدس سے مراد وہ پاکیزہ روح ہے جو خدا کی طرف سے آتی ہے اور عبرانی میں اس سے مراد جبریل ہیں۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸)

'قلوبنا غلف' کے دو مفہوم

یہ قول یہود کی طرف سے بطور ایک عذر لنگ کے بھی ہو سکتا ہے اور بطور اظہار تکبر کے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ باتیں (جو پیغمبر پیش کرتے ہیں) ہمارے دل میں تو کسی طرح اترتی نہیں۔ اگر یہ خدا کی طرف سے ہیں تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، آخر وہ ہمارے دلوں کو ان باتوں کے لیے کھول کیوں نہیں دیتا۔

دوسری صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے دل و دماغ اس قسم کی لایعنی باتوں کے لیے نہیں بنے ہیں اس وجہ سے یہ کسی طرح بھی ہمارے دلوں میں نہیں دھنستی ہیں، اگر ان میں ذرا بھی معقولیت ہوتی تو معقول باتوں کے قبول کرنے کے معاملہ میں ہم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کے نظائر و شواہد ان دونوں ہی مفہوموں کی تائید میں موجود ہیں لیکن ہم یہاں دوسرے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اس قول کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے) اس سے واضح تائید اسی مفہوم کی نکلتی ہے۔ یعنی وہ تو اپنے گھمنڈ اور غرور کے سبب سے یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کی باتیں ہی ایسی ہیں جو کسی معقول آدمی کے دل میں نہیں اتر سکتیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے، یہ باتیں تو نہایت معقول اور نہایت دل نشین ہیں لیکن ان لوگوں کے کفر اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے ان کے

دلوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کر دی ہے اس وجہ سے اب ان کے اندر ان معقول باتوں کے قبول کرنے کے لیے کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۸۹)

یہود پر قرآن کا احسان

کتاب سے یہاں مراد قرآن مجید ہے جو ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہوا تھا جو اس کے بارے میں یہود کے صحیفوں میں وارد تھیں۔ اس پہلو سے قرآن کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا احسان خود یہود پر تھا کہ اس نے ان کے صحیفوں کی بہت سی باتوں کو سچا ثابت کیا۔ اس احسان کا حق تو یہ تھا کہ وہ سب سے آگے بڑھ کر اس کتاب عزیز کو ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے کے بجائے ضد اور حسد کے سبب سے اس کی مخالفت کی راہ میں سبقت کی۔ قرآن مجید کو پچھلے صحیفوں کے مصدّق کہنے کی حقیقت اسی سورہ کی آیت ۴۱ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں۔

قرآن اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں چونکہ یہود کے صحیفوں میں موجود تھیں اس وجہ سے ان کو ان پیشین گوئیوں کے ظہور کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار تھا۔ ان کو امید تھی کہ جب اس نبی موعود کی بعثت ہو گی تو ان کی بدبختی اور مصیبت کے دن دور ہو جائیں گے اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان کو ان کے تمام دشمنوں پر فتح دے گا۔ اس فتح کے لیے وہ دعائیں بھی کرتے تھے لیکن یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ جب یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی، جس کا انتظار تھا وہ آ چکا اور اس کے کارناموں نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ یہ وہی ہے جس کی علامتیں پچھلے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں اور یہود نے اس کو اچھی طرح پہچان بھی لیا تو محض ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا انکار کر دیا۔ یہود کے اس رویہ کو حضرت مسیح علیہ السلام نے دس کنواریوں والی تمثیل میں واضح فرمایا ہے جو متی کے باب ۲۵ میں منقول ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۹۰)

اشتراء کا مفہوم

یہاں اشتراء کے معنی بیچنے اور مبادلہ کرنے کے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون اسی سورہ میں دوسری جگہ اس طرح وارد ہے وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۲-بقرہ) (کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے عوض میں انھوں نے اپنی جان کو بیچا) عام طور پر اہل لغت اس لفظ کو اضداد میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے اضداد میں سے ہونے کی امام راغب نے بڑی معقول توجیہ کی ہے وہ کہتے ہیں۔ فاما اذا كان بيع سلعة بسلعة صح ان يتصور كل واحد منهما مشتريا وبائعا ومن هذا الوجه صار لفظا البيع والشراء يستعمل كل واحد منهما فى موضع الاخر لیکن جب شے کا مبادلہ شے سے ہو تو فریقین میں سے ہر ایک

کو مشتری اور ہر ایک کو بائع سمجھنا صحیح ہوگا، اس پہلو سے بیع اور شرا کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں) اس تحقیق کی روشنی میں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ ہوگا (کیا ہی بری ہے وہ چیز جس سے انھوں نے اپنی جانوں کا مبادلہ کیا) یعنی اپنی نجات و فلاح کی فکر سے بے نیاز ہو کر دوسروں کی ضد میں مبتلا ہوئے اور پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔

اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بَغۡیًا اَنۡ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ: یہ وضاحت ہے اس چیز کی جس کو ان لوگوں نے اختیار کیا۔ وہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لانے کے بجائے اس کے انکار اور اس کی مخالفت کی راہ اختیار کی اور چونکہ انکار اور مخالفت کی یہ راہ دیدہ و دانستہ اختیار کی گئی اس وجہ سے اس کا سبب اس ضد اور عناد کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ان کو اللہ تعالیٰ پر غصہ تھا کہ اس نے آخری دین اور آخری رسول کی نعمت سے بنی اسماعیل کو کیوں نوازا، خود ان کے اندر سے کسی کو رسول کیوں نہیں بنایا؟ گویا اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کے اجارہ دار یہی ہیں اور انھی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بتائیں کہ وہ کس منصب کے لیے کس کو منتخب کرے اور کس کو منتخب نہ کرے۔

بغی کے معنی یہاں ضد کے ہیں۔ یہ ضد ان کی خدا سے سرکشی اور ان کے استکبار کا نتیجہ تھی عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن اشارہ یہاں خاص طور پر بنی اسماعیل کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اختیار کی وسعت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ عموم کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ ؕ وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ: "وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر لوٹے" کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ جہاں سے ان کو سب سے بڑی رحمت لے کر لوٹنا تھا وہاں سے وہ اپنی شامتِ اعمال کے باعث خدا کا غضب لے کر لوٹے۔ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت و کامرانی آخری نبی پر ایمان کے ساتھ وابستہ تھی اور یہ اس کے متوقع اور منتظر بھی تھے بلکہ اس کے لیے، جیسا کہ اوپر گزرا، دعائیں بھی کرتے رہے تھے۔ لیکن جب اس نعمت سے متمتع ہونے کا موقع آیا تو ان کی بدبختی نے ان کو ٹھوکر کھلائی اور وہ اس کی مخالفت کی پاداش میں غضبِ الٰہی کے مستحق قرار پائے۔ پھر صرف غضب ہی کے نہیں بلکہ غضب در غضب کے مستحق قرار پائے۔ ایک غضب کے مستحق تو وہ اس عہد کو توڑنے کے سبب سے ٹھہرے جو اللہ تعالیٰ سے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے باندھا تھا اور دوسرے غضب کے مستحق اس وجہ سے ہوئے کہ جب ان کے لیے پھر خدا کے عہد میں داخل ہونے کا موقع آیا تو انھوں نے ضد اور حسد میں مبتلا ہو کر اس سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ سے مراد ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ یہ ذلیل کرنے والا عذاب ان کو اس لیے دیا جائے گا کہ ان کے جرائم کا اصل محرک استکبار تھا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ

اَسْتَكْبَرْتُمْ (کیا جب جب کوئی رسول تمھارے پاس کوئی ایسی بات لے کر آئے گا جو تمھاری خواہشوں کے خلاف ہوئی تو تم استکبار کے ساتھ اس کا انکار کر دو گے) ۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹۱)

یہود کا ایمان نہ قرآن پر نہ تورات پر

یعنی جب ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ بڑے غرور کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہی ہیں جو ہم پر اتری ہے ۔ اس کے بعد ان کے قول کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ تورات کے بعد وہ کسی چیز پر ایمان لانے کے قائل نہیں ہیں حالانکہ اب تورات کی اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق بھی صحیفہ حق وہی ہے جس کو قبول کرنے کی ان کو دعوت دی جا رہی ہے نہ کہ تورات ۔

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ، یہ واضح کرنے کے بعد کہ قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد معتبر ایمان وہی ہے جو قرآن پر ہو نہ کہ صرف توراۃ پر ، یہ واضح فرمایا کہ ان یہود کا تورات پر ایمان کا دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے ۔ اگر یہ فی الواقع تورات پر ایمان رکھنے والے ہوتے تو اللہ کے ان نبیوں کو قتل کرنے کی جسارت کس طرح کرتے جو اسی تورات کی تجدید و تصدیق کے لیے آئے ۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۹۲)

یہود کے دعوائے ایمان کی مزید تردید

یہ یہود کے دعوائے ایمان کی مزید تردید ہے اور اس تردید کا خاص پہلو یہ ہے کہ ان کی ابتدائی تاریخ کے واقعۂ گوسالہ پرستی کو یاد دلا کر ان کو سرزنش کی گئی ہے کہ آج تم نے اپنے ایمان اور اپنی دینداری کی حکایت اتنی بڑھا رکھی ہے کہ نہ قرآن کو خاطر میں لانے کے لیے تیار ہو نہ پیغمبر آخر الزماں کو حالانکہ تمھارے اس ایمان کا حال آج تو درکنار شروع سے یہ رہا ہے کہ عین موسیٰ کی موجودگی میں ، ان کے کھلے کھلے معجزات کو دیکھتے ہوئے تم نے اپنے رب کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کی عبادت شروع کر دی ۔

یہود کے اسی قسم کے فخر پر بعض پچھلے انبیاء نے بھی ان کو سرزنش کی ہے اور اسی واقعۂ گوسالہ پرستی کی طرف تعریض کرتے ہوئے یہ الفاظ تک فرمائے ہیں کہ "اے اسرائیل (بنی اسرائیل) تو تو وہ ہے کہ تو نے پہلی شب میں بے وفائی کی" قرآن کے الفاظ اس کے اپنے مرتبے کے شایانِ شان ہیں لیکن بات وہی کہی گئی ہے جو سابق انبیاء نے فرمائی تھی ۔

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ٹھیک ٹھیک وَاَنْتُمْ مُشْرِكُوْنَ کے معنی میں ہے ۔ قرآن میں شرک کو متعدد مقامات میں ظلم کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ ظلم کا اصلی مفہوم حق تلفی ہے ۔ خدا کے حقوق اور خود اپنے نفس کی جو حق تلفی آدمی شرک کا ارتکاب کر کے کرتا ہے وہ کسی بھی اور دوسرے طریقہ سے نہیں کرتا ۔ اس کی وضاحت قرآن مجید نے متعدد

مقامات میں کی ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۹۳)

حال کی تعبیر قول سے

اسی سورہ کی آیت ۶۳ کی تفسیر کرتے ہوئے اس ٹکڑے کے تمام اہم اجزا کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہود کا یہ جواب جو نقل ہوا ہے، قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (انھوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی) یہ صورتِ حال کی تعبیر ہے۔ انھوں نے عہد تو یہی کیا تھا کہ "ہم نے سنا اور ہم اطاعت کریں گے" لیکن عمل ان کا یہی ہوا کہ انھوں نے جو کچھ سنا اس کی نافرمانی کی۔ اس صورتِ حال کو، جو ان کے عمل سے ظاہر ہوئی، قرآن نے ان کے قول کی جگہ رکھ دیا ہے۔ گویا انھوں نے شروع ہی میں اقرار اطاعت کا نہیں بلکہ نافرمانی کا کیا تھا۔

منافقین اور یہود آنحضرت صلعم کی مجلس میں جب کبھی آتے تو سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا کی جگہ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ہی کہتے لیکن ادا اس طرح کرتے کہ سننے والا عَصَيْنَا کو أَطَعْنَا سمجھے۔ یہ روش انھوں نے اپنے اسلاف ہی سے سیکھی تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ أَطَعْنَا کہتے اور اس سے عَصَيْنَا مراد لیتے اور یہ عَصَيْنَا کہتے اور یہی مراد بھی لیتے لیکن زبان کو توڑ مروڑ کر مغالطہ یہ دیتے کہ مسلمان ان کے عَصَيْنَا کو أَطَعْنَا سمجھیں۔

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۹۴)

یہود کی دکھتی ہوئی رگ

اوپر کی آیت ۹۰ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ یہود اس بات سے بہت برافروختہ ہوتے تھے کہ خدا کے کسی فضل و انعام کا حق دار ان کے سوا کسی اور کو بھی سمجھا جائے۔ وہ دنیا میں بھی ہر خدائی نعمت کا حق دار اپنے ہی کو سمجھتے تھے اور آخرت کی نعمتوں کا حق دار بھی تنہا اپنے ہی کو سمجھتے تھے۔ قرآن نے ان کو متنبہ کیا کہ اگر تم فی الواقع آخرت کی تمام کامیابیاں اپنا ہی حصہ سمجھتے ہو، اس میں دوسروں کا کوئی حصہ تسلیم نہیں کرتے تو اس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ تمھیں لقائے رب کا شوق ہو اور تم اس کے لیے موت کی آرزوئیں کرو، لیکن تمھارا حال تو یہ ہے کہ تم زندگی کی محبت میں اہل کتاب ہو کر عرب کے مشرکوں کو بھی مات دے گئے ہو۔

قرآن نے یہود کی یہ ایک بہت دکھتی رگ پکڑی ہے تاکہ خدا کے محبوب و مقرب ہونے کا ان کو جو گھمنڈ تھا اس پر ذرا وہ شرمائیں۔ اگرچہ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس بات کے جواب میں کہہ سکتے تھے کہ ہم تو موت کی بڑی آرزو رکھنے والے لوگ ہیں لیکن آدمی سے خود اپنے دل کا حال چھپا ہوا نہیں ہوتا اس وجہ سے یہ حقیقت ان کے لیے بڑی تلخ اور ان کو خود ان کی نگاہوں میں بڑی رسوا کرنے والی تھی۔

وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۹۵)

یعنی اللہ تعالیٰ سے قرب اور آخرت کی اجارہ داری کے ادعا کے باوجود موت کی آرزو یہ کبھی نہیں کریں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اور اس کی شریعت کے ساتھ جو بدعہدیاں اور غداریاں انھوں نے کی ہیں وہ دوسروں کے سامنے ہوں یا نہ ہوں لیکن خود ان سے یہ ڈھکی چھپی نہیں ہیں، اس وجہ سے موت کے تصور سے ان پر لرزہ طاری ہوتا ہے لیکن موت سے یہ کب تک بھاگیں گے؟ اور اس سے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ بالآخر ایک دن موت سے دوچار ہونا اور اس رب کے سامنے حاضر ہونا ہے جو ان ظالموں کے تمام اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اس حقیقت کو سورہ جمعہ میں اس طرح واضح فرمایا ہے۔ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸) (کہہ دو وہ موت جس سے تم بھاگ رہے ہو تمھیں پاکے رہے گی، پھر تم غیب اور حاضر کے جاننے والے کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور وہ تمھیں ان ساری باتوں سے آگاہ کرے گا جو تم کر رہے ہو)۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ (۹۶)

یہود مشرکین سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں

یعنی ایک طرف تو خدا کے ساتھ محبت و محبوبیت کے یہ دعوے ہیں، دوسری طرف زندگی کی محبت کا یہ حال ہے کہ ساری دنیا سے زیادہ زندگی کے حریص یہ ہیں۔ یہاں تک کہ اس معاملہ میں یہ عرب کے ان مشرکوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں جن کے ہاں یہ دنیا ہی دنیا ہے آخرت کا جن کے سامنے سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

قرآن نے ایک سے زیادہ مقامات میں یہود کا موازنہ مشرکین عرب سے کرکے یہ دکھایا ہے کہ یہ عقیدہ اور عمل دونوں ہی اعتبارات سے مشرکین سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں، مشرکین کتاب و شریعت سے بے بہرہ ہونے کے سبب سے قدرتی طور پر فکری اور اخلاقی حیثیت سے نہایت پست سطح پر تھے۔ قرآن نے یہ واضح کیا ہے کہ کتاب اور شریعت کے نہایت بلند بانگ دعاوی کے باوجود اخلاقی اعتبار سے یہ یہود مشرکین کو بھی شرماتے ہیں حالانکہ یہ ان کو نہایت حقیر سمجھتے ہیں۔

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ: اس کا ایک ترجمہ تو وہی ہو سکتا ہے جو ہم نے کیا ہے۔ دوسرا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس کی عمر کی درازی اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی: معنی کے اعتبار سے دونوں ترجموں میں کوئی فرق نہیں ہے اور زبان کے قواعد کے لحاظ سے بھی میرے نزدیک دونوں صحیح ہیں۔ لیکن اکثر اہل تاویل نے اختیار اسی دوسرے کو کیا ہے۔

وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ: یعنی لمبی سے لمبی عمر بھی کسی کے اعمال کو خدا سے چھپا نہیں سکتی۔ خدا ان ساری چیزوں کو دیکھ رہا ہے جو یہ کر رہے ہیں اور جب دیکھ رہا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کا بدلہ نہ دے۔ یہاں دیکھنے سے مراد وہ چیز ہے جو اس دیکھنے سے لازم آتی ہے۔ کلام کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بے شمار مواقع میں استعمال ہوا ہے۔

۴۰۔ اس مجموعۂ آیات کی بعض تعلیمات

اس مجموعۂ آیات کی تعلیمات کی طرف تو ہم اس کے اجزاء کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کرتے آئے ہیں، وہ کافی ہے۔ لیکن بعض چیزیں اس میں ایسی بیان ہوئی ہیں جن کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ان کی طرف ہم پھر اشارہ کر دیں۔

خدا کی شریعت کا حق اس کے ہر جزو پر عمل کرنے سے ادا ہوتا ہے

۱۔ اس میں ایک بڑی اہم حقیقت تو یہ واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ جو شریعت دیتا ہے اس کا حق اس کے ہر جزو پر عمل کرنے سے ادا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے ان اجزا پر عمل کرے جو اس کی خواہشات کے موافق ہیں اور جن کو اپنی خواہشات کے خلاف پائے ان کو نظرانداز کر دے تو یہ چیز قرآن کی اصطلاح میں ایمان ببعض الکتاب اور کفر ببعض الکتاب ہے اور اس طرح کا ایمان اللہ تعالےٰ کے ہاں نہ صرف یہ کہ معتبر نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کی سزا قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ "ان کے لیے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے اور آخرت میں یہ سخت ترین عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔"

قبولِ حق کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ

۲۔ دوسری حقیقت یہ واضح کی گئی ہے کہ قومی تفاخر، گروہی عصبیت اور جماعتی برتری کا زعم قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو گروہ اس بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے لیے اس حق کے سوا جس کو وہ خود حق قرار دے کسی اور حق کو قبول کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی چیز اس استکبار کی جڑ ہے جسے قرآن میں ابلیس کی خصوصیت بتایا گیا ہے اور اسی سے وہ حسد پیدا ہوتا ہے جو ہر اس حق سے نفرت اور چڑ پیدا کر دیتا ہے جو اپنی خواہشات کے خلاف ہو۔

زندگی کی حرص محبتِ الٰہی کے منافی ہے

۳۔ تیسری حقیقت یہ واضح کی گئی ہے کہ جس طرح زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنا یا خودکشی کرنا ایمان اور تعلق باللہ کے منافی ہے اسی طرح زندگی اور درازئ عمر کا حریص ہونا اور موت سے فرار بھی ایمان اور محبتِ الٰہی کے منافی ہے۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ سے محبت کرتے ہیں وہ موت سے بھاگتے نہیں بلکہ وہ اللہ کی راہ میں موت کی تمنا کرتے ہیں۔ نیز ضمناً یہاں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ جو چیز انسان کو موت سے ڈراتی ہے وہ درحقیقت گناہ اور خدا سے بغاوت کی زندگی ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی کو گناہوں اور نافرمانیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرے تو موت اس کے لیے ایک محبوب چیز بن جاتی ہے۔

۴۱۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۹۷-۱۰۳

یہود کی قرآن دشمنی کی مزید تفصیل

آگے یہود کی اس قرآن دشمنی کی مزید تفصیل کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا کہ یہود اس دشمنی میں اللہ، اس کے ملائکہ، اس کے انبیاء اور جبریل و میکائیل سب کے دشمن بن گئے ہیں اور اس طرح انھوں نے خدا کو اپنا

دشمن بنا لیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس قرآن دشمنی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حق کے دلائل ان پر واضح نہیں ہیں، دلائل تو پوری طرح واضح ہیں لیکن یہ نافرمان اور عہد شکن لوگ ہیں، ابتدا ہی سے ان کی روش یہ رہی ہے کہ جب بھی انھوں نے خدا سے کوئی عہد باندھا ہے اس کو انہی کے اندر کی ایک جماعت نے موقع آنے پر توڑ دیا ہے۔ چنانچہ خدا کے آخری رسول کے بارے میں بھی انھوں نے یہی روش اختیار کی، یہ تورات کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق آئے ہیں لیکن یہود نے تورات پر ایمان لانے کے مدعی ہوتے ہوئے محض ضد میں آکر اس طرح کتاب الٰہی کو پیٹھ پیچھے پھینکا ہے گویا اس سے کبھی آشنا ہی نہیں تھے۔ پھر فرمایا کہ ان کی اصل دلچسپی اللہ کی کتاب سے نہیں ہے بلکہ ان سفلی اور شیطانی عملیات سے ہے جو فلسطینیوں اور کلدانیوں وغیرہ سے انہوں نے سیکھی تھیں۔ سحر و شعبدہ اور گنڈے، تعویذ وغیرہ کی قسم کی چیزوں نے ان کو خدا کی کتاب سے بالکل بے پروا کر کے ایک بالکل دوسری ہی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۹۷-۱۰۲

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ
وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ
مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا
لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲

ترجمۂ آیات ۹۷-۱۰۳

کہہ دو کہ جو جبریل کا مخالف ہوا تو وہ جان لے کہ جبریل نے اس کلام کو تمہارے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے، مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور یہ ہدایت و بشارت ہے اہلِ ایمان کے لیے جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کے دشمن ہوئے تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔ ۹۷-۹۸

اور ہم نے تمہارے اوپر نہایت واضح دلیلیں اتاری ہیں۔ ان کا انکار صرف عہد شکن ہی لوگ کر سکتے ہیں۔ کیا ان کی یہی روش قائم رہے گی کہ جب جب کوئی عہد کریں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو اٹھا پھینکے گا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے عاری ہیں۔ ۹۹-۱۰۰

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول ان پیشین گوئیوں کے مطابق آیا جو ان کے پاس موجود ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا ہی نہیں اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہدِ حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں ہی نے کفر کیا۔ یہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ ۱۰۱-۱۰۲

اور اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دونوں فرشتوں۔ ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی تھی

حالانکہ یہ کسی کو سکھاتے نہیں تھے جب تک اس کو خبردار نہ کر دیں کہ ہم آزمائش کے لیے ہیں تو تم کفر میں نہ پڑ جانا۔ پس یہ لوگ ان سے وہ علم سیکھتے جس سے میاں اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں۔ حالانکہ یہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مشیت کے بغیر کسی کو نقصان پہنچانے والے نہیں بن سکتے تھے اور یہ وہ چیز سیکھتے تھے جو ان کو نقصان پہنچائے، حالانکہ ان کو پتہ تھا کہ جس نے اس چیز کو اختیار کیا آخرت میں اس کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ کیا ہی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انھوں نے اپنی جانوں کو بیچا۔ اے کاش وہ اس کو سمجھتے! ١٠٢

اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کا ثواب ان کے لیے کہیں بہتر تھا کاش وہ سمجھتے! ١٠٣

۴۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (٩٧)

اس جملہ میں فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ جواب شرط کے محل میں ہے۔ عربی زبان میں جب کبھی شرط کا جواب اس طرح آئے تو اس کے اندر ایک تفصیل پوشیدہ ہوتی ہے جس پر بعد کے جملہ سے روشنی پڑتی ہے۔ یہاں سیاقِ کلام سے جملہ کا مطلب یہ واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ جبریل کے مخالف ہیں ان پر یہ حقیقت واضح رہنی چاہیئے کہ جبریل کی مخالفت درحقیقت اللہ کی مخالفت ہے کیونکہ جبریل نے خدا کا کلام جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا ہے تو اپنے جی سے نہیں اتارا ہے بلکہ خدا ہی کے حکم سے اتارا ہے۔ جبریل کوئی کام بھی من مانے طور پر نہیں کرتے، جو کچھ کرتے ہیں خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے حکم کے تحت کرتے ہیں نَزَّلَهٗ میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر اوپر آیت ٩١ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے چلا آ رہا ہے اس وجہ سے یہاں اضمار قبل الذکر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بات اوپر والی بات ہی کا ایک جزو ہے۔

قرآن کی ضد میں جبریلؑ سے دشمنی

معلوم ہوتا ہے کہ یہود، قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضد میں جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا مخالف ظاہر کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے یہود کے علماء اور لیڈروں کو جب یہ اندیشہ ہوا ہو کہ قرآن کی دعوت ان کے عوام کو

کہیں متاثر نہ کر دے تو انھوں نے یہ اشتقلہ چھوڑا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ان کے اپنے بیان کے مطابق جبریل فرشتہ آتا ہے اور یہ فرشتہ ہمارا دیرینہ مخالف ہے، ہمارے اوپر فلاں فلاں آفتیں اسی کے ہاتھوں آئیں، اس وجہ سے ہم کسی ایسے شخص پر ایمان نہیں لا سکتے جس کی ہمارے مخالف فرشتہ سے سازباز ہے۔

اگرچہ یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ یہود حماقت کی اس حد کو پہنچ جائیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگ جائیں لیکن انسان جب ضد، حسد اور فرقہ سازی کے جنون میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں رہ جاتی۔ روافض کے ایک فرقہ کا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن دراصل اترنا تو تھا حضرت علیؓ پر لیکن جبریل غلطی سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اس کو لے کر چلے گئے۔ اس فرقہ کے لوگ اس گناہ پر (نعوذ باللہ) حضرت جبریل امین پر لعنت بھی کرتے ہیں۔[1]

قرآن نے یہود کی اس حماقت پر جو گرفت کی ہے وہ بڑی برمحل اور بڑی ہی سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس غصہ میں جبریل کے مخالف بن بیٹھے ہو کہ انھوں نے یہ وحی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کیوں اتاری، تمھارے کسی آدمی پر کیوں نہ اتاری تو یہ تو سوچو کہ تمھاری یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ تم اللہ کو بھی اپنا مخالف سمجھتے ہو کیونکہ جبریل بہرحال تمہارے اپنے عقیدہ کے مطابق بھی خدا کے فرشتے ہیں، وہ کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں کر سکتے۔ لازماً یہ کام بھی انھوں نے خدا ہی کے حکم سے کیا ہے۔ پھر تم تنہا جبریل ہی کے نہیں بلکہ خدا کے بھی مخالف ہوئے اور خدا بھی تمھارا مخالف ٹھہرا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ میں قرآن کی مزید تین صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پچھلے صحیفوں کا مصدق ہے۔ دوسری یہ کہ وہ راہِ حق کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ تیسری یہ کہ جو اس کی رہنمائی قبول کر لیں وہ ان کو آخرت کی فوز و فلاح کی بشارت سنا رہا ہے۔ یہ تفصیل یہاں اس لیے پیش کی گئی ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہود کی یہ مخالفت صرف قرآن ہی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی کتاب کی بھی مخالفت ہے، وہ اس ہدایت کے بھی مخالف ہیں جو پہلے نازل ہوئی اور اس ہدایت کے بھی دشمن ہیں جو اب دنیا کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (۹۸)

بات کہاں سے کہاں پہنچی!

حضرت جبریل کی مخالفت سے جس جس کی مخالفت لازم آتی ہے یہ اس کی تفصیل بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شرارت کی جو سزا ہے اس کا بیان بھی۔ اوّل درجہ میں تو اس سے خود اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی مخالفت

[1] حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ "رد روافض" میں روافض کے مختلف فرقوں کے عقائد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وطائفۂ غرابیہ از ایشاں می گویند کہ محمد بہ علیؓ مشابہ تر بود از مشابہت غراب بہ غراب و مگس با مگس وحق تعالیٰ وحی بجانب علی فرستادہ بود جبریل از کمال مشابہت غلط کردہ وحی بمحمد رسانید...... وایشاں جبریل را لعن می کنند۔

لازم آتی ہے اس کی وجہ اوپر والی آیت میں بیان ہو چکی ہے کہ جب یہ ایک ایسے کام کی بنا پر جبریل ہی سے خفا ہیں جو جبریل نے خدا کے حکم سے کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خود خدا کے بھی مخالف ہیں۔ پھر اس سے تمام فرشتوں، تمام رسولوں اور جبریل و میکائیل سب کی مخالفت لازم آتی ہے اس لیے کہ خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں میں کامل ہم آہنگی ہے۔ فرشتے اور انبیا سارے کام خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہی کرتے ہیں اور ایک ہی حزب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہو سکتی۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی مخالف ہوا وہ سب کا مخالف ہوا اور جس نے کسی ایک کی بھی تکذیب کی اس نے سب کی تکذیب کی۔ یہاں یہ اجمالی اشارہ کافی ہے آگے اس کی مزید تفصیل آئے گی۔

یہاں عام فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد جبریل اور میکائیل کا ذکر خاص طور پر ایک تو ان کی اہمیت کے سبب سے ہے جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل، جیسا کہ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے، میکائیل فرشتہ کو حضرت جبریل کے برعکس اپنا ہمدرد فرشتہ سمجھتے تھے۔ قرآن نے یہاں حضرت جبریل کے ساتھ حضرت میکائیل کو شامل کر کے یہ واضح کیا ہے کہ جبریل کا مخالف جس طرح اللہ اور اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کا مخالف ہے اسی طرح وہ میکائیل کا بھی مخالف ہے اس لیے کہ خدا کے تمام فرشتوں اور تمام رسولوں کی ملت ایک ہے۔ جبریل اور میکائیل دونوں اسی ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی رقابت اور چشمک نہیں ہے کہ جبریل سے جن کی لڑائی ہو میکائیل ان سے دوستی گانٹھے رکھیں۔

'فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ' کے ٹکڑے سے بیک وقت دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک تو یہ کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں اور اس کے فرشتوں کے مخالف اور دشمن ہیں وہ کافر ہیں اور دوسری یہ کہ اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ قرآن کے ایجاز بیان نے ان دونوں باتوں کو اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ بات بھی پوری ہو گئی ہے اور مخاطب کے لیے انکار اور بحث کی کوئی گنجائش بھی پیدا نہیں ہونے پاتی ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (۹۹)

'آیات بینات' سے مراد

خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ آیات بینات سے مراد آپ کی نبوت و رسالت کی وہ واضح اور قطعی دلیلیں ہیں جو آپ پر نازل ہوئیں، عام اس سے کہ وہ قرآن کے مدلل بیانات کی صورت میں ہیں یا ان کارناموں، علامات، شواہد اور معجزات کی شکل میں جو آپ کے ذریعہ سے ظہور میں آئے۔ فرمایا کہ یہ چیزیں آپ کی نبوت کے ثبوت میں اس قدر واضح ہیں کہ جس کے اندر ذرا بھی معقولیت ہو وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا، صرف وہی لوگ ان کا انکار کر سکتے ہیں جو نافرمان اور عہد شکن ہوں۔

'فسق' کا مفہوم

فسق کا اصلی مفہوم خدا کی نافرمانی ہے۔ نافرمانی چھوٹی بھی ہو سکتی ہے، بڑی بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ بڑی سے بڑی نافرمانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا یہی مفہوم یہاں بھی ہے سیاق سباق سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر بات دلائل و شواہد کی ہو تب تو قرآن کی صداقت

واضح ہے لیکن جو لوگ خدا کے ہر عہد و پیمان کو توڑ ڈالنے کا فیصلہ کر چکے ہوں ان کے نزدیک ان دلائل و شواہد کی کیا اہمیت ہے۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰۰)

یہ اسلوبِ کلام اظہارِ تعجب اور اظہارِ حسرت کا ہے۔ اوپر یہود کی عہد شکنیوں کا ذکر کرتے ہوئے بات یہاں تک پہنچی تھی کہ یہی عہد شکنی کی روش انھوں نے اس عہد کے معاملہ میں اختیار کی ہے جو آخری کتاب اور آخری رسول سے متعلق ان سے لیا گیا تھا۔ پھر باندازِ تعجب و اظہارِ حسرت فرمایا کہ کیا ان کی یہی روش ہمیشہ باقی رہے گی کہ جب کبھی یہ خدا سے کوئی عہد باندھیں گے تو وقت آنے پر یہ اس کو توڑ تاڑ کے رکھ دیں گے، صرف تھوڑے سے لوگ اس پر قائم رہ سکیں گے۔ پھر اصل حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینے کے لیے فرمایا کہ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی ان کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو سرے سے ایمان ہی سے عاری ہیں، یہ تورات پر ایمان کا دعوےٰ تو کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت ایمان کسی چیز پر بھی نہیں رکھتے۔

وَلَمَّا جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۱)

اوپر والی آیت میں یہود کی عہد شکنی کی جس روش کا ذکر ہوا ہے اس آیت میں اسی کی واقعاتی شہادت پیش کر دی گئی ہے کہ دیکھو جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آیا جو ان پیشین گوئیوں کے بالکل مطابق ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہیں تو ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہے گویا اس سے کبھی کے آشنا ہی نہیں ہیں۔

رسول سے مراد — "رسول" سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظ اگرچہ نکرہ کی صورت میں استعمال ہوا ہے لیکن بعد کی صفات اور سیاق و سباق سے مراد متعین ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے رسول کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

"کتاب اللہ" سے مراد تورات بھی ہو سکتی ہے اور قرآن بھی۔ تورات مراد لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان اہل کتاب نے اہل کتاب ہو کر اللہ کی کتاب کو نبی آخر الزمان کے معاملہ میں اس طرح نظر انداز کیا ہے گویا اس کو جانتے ہی نہیں۔ قرآن مجید مراد لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ایک کتاب کو شناخت کرنے کے سب سے زیادہ اگر اہل تھے تو یہ تھے اس لیے کہ یہ ایک آسمانی کتاب کے وارث اور امین ہونے کے مدعی بھی تھے اور اس طرح کی ایک کتاب کے نزول کی ان کو پہلے سے خبر بھی تھی لیکن ضد اور حسد کا برا ہو کہ اہل کتاب ہو کر وہ اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک رہے ہیں گویا اس کو جانتے ہی نہیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ